ہفت روزہ
ندائے خلافت
لاہور
۲۵/ اکتوبر ۱۹۹۴ء

☆ ڈالروں کی مشرق و مغرب سے اُڈتی گھٹاؤں کی حقیقت
☆ اپنی اس اجتماعیت کی قدر پہچانئے :
(سالانہ اجتماع کے موقع پر ایک رفیقِ تنظیم اسلامی کی توجہ طلبی)
☆ ہائے، ترکی کا مسلمان نوجوان روحانیت کے لئے کیسے ترستا ہے

حدیثِ امروز

اَھلاً وّسَھلاً ــــ مَرحَبا

تنظیم اسلامی کے انیسویں سالانہ اجتماع کے موقع پر اپنے رفقاء اور تنظیم کی تحریکِ خلافت کے معاون بننے والوں میں سے ان دوستوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے ہم انہیں اہلاً و سہلاً' مرحبا کہتے ہیں جو سوچ سمجھ کر اختیار کئے ہوئے اپنے راستے کے ایک اور سنگِ میل کو نصب کرنے کی تقریب میں شریک ہو پائے ہیں اور ان ساتھیوں کے لئے دست بدعا ہیں جنہیں فلک کی گردش نے اتنا بھی چین نہ دیا کہ اس اہم موقع پر اپنے قافلے کے ہمرکاب ہو سکتے۔ اس سنگِ میل سے یہ تو پتہ چل جاتا ہے کہ کتنا سفر طے ہو گیا' یہ معلوم نہیں ہو گا کہ کتنا باقی ہے۔ معلوم ہونا بھی نہیں چاہئے ورنہ شوقِ سفر کو آسودگی حاصل ہو گی۔ "اے عشق بتا اب کیا ہو گا' کہتے ہیں کہ منزل دور نہیں"۔ یا پھر مایوسی قوائے عمل کو شل کر دے گی۔ "وہی میری کم نصیبی' وہی تیری بے نیازی"۔ تاہم منزلِ مراد تو طے شدہ ہے اور راہ کے مراحل کو بھی میرِ کارواں کی واضح نشاندہی نے روشن کر دیا اور بے مقصدی کے دھندلکوں سے نکال باہر کیا ہے۔ ہاں' یہ تعین کوئی بھی نہیں کر سکتا کہ اس راہ میں اہلِ قافلہ پر گزرے گی کیا۔ تاریخِ عزیمت کی ورق گردانی کرتے رہئے تو کچھ اندازہ ضرور ہو جائے گا اور اب تک کے ذاتی تجربات کا جائزہ لیجئے تب بھی کسی حیرت سے واسطہ نہیں پڑے گا کیونکہ "اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے' سو گزری"۔ اللہ کا وعدہ البتہ سچا ہے' پورا ہو کر رہنے والا ہے۔ جو لوگ قدم سوئے منزل بڑھاتے' چلتے چلتے نڈھال ہو کر گریں اور آبلہ پا ربِ کریم کے دربار میں جا کر حاضری لگوائیں گے' وہ کامیاب ہوئے' فلاح پا گئے اور جو تھک کر بیٹھ رہے یا منہ ہی موڑ لیا وہ اپنا جواب سوچ رکھیں۔ وہاں ان کی وکالت کون کرے گا جہاں زبان کو تو اذنِ کلام ہو گا ہی نہیں' معذرتیں پانی کے بلبلوں کی طرح بیٹھ جائیں گی اور اپنے ہی اعضاو جوارح دشمنِ جاں بن کر استغاثے کے گواہ بن جائیں گے جو آج نت نئے بہانے تراش کر دیتے ہیں۔

نشاطِ منزل کیسے حاصل ہو گی اور کب؟ یہ فیصلہ کرنا بھی ہمارا کام نہیں جو ہم کرنے بیٹھ گئے تو ظن و تخمین کے دامِ ہمرنگِ زمیں کے اسیر ہو جائیں گے اور کیا عجب "حبِ عاجلہ" ہمیں شکار کر لے اور اس تھوڑی بہت جمع جوڑ' اس پونجی سے بھی محروم کر دے جو بڑی محنت کے بعد میسر آئی ہے۔ بندہ جوڑے پَلی پَلی اور رام لُنڈھائے کُپا۔ ایسے نقصانِ مایہ سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگئے جس کے ساتھ شماتتِ ہمسایہ مفت میں ملتی ہے۔ ہمراہیوں کی کثرت و قلتِ تعداد کو بھی بس ایک پیمانے کے طور پر استعمال کیجئے جس سے آپ کو صرف اپنی ذاتی تگ و دو' کد و کاوش' جدوجہد اور دل کی لگن کو ماپنا ہے' اپنی تحریک کے مبنی بر حق ہونے پر اس سے قیاس کیا تو بڑے خسارے کا سودا ہو گا۔ آپ کے پاس تو حق و صداقت' خوب و زشت اور ہدایت و ضلالت کا وہ معیار ہے جس میں ابد تک اب کسی حک و اضافے کی ضرورت نہیں جو نیک نیتی سے بھی کیا جائے تو محنت کے اکارت جانے کا باعث بن جاتی ہے۔ آپ کو اپنی انقلابی تحریک کو کتاب و سنت سے ماخوذ منہجِ انقلابِ نبوی ﷺ پر گامزن رکھنا ہے جس کے نقوش کو واضح کرنے کے لئے آپ کا میرِ کارواں دنیا بھر میں صورتِ جام پھرا۔ اسی پر قدم جما جما کر رکھئے اور جہاں پھسلنے کا امکان ہو' اسی عروۃ الوثقیٰ کا سہارا لیجئے۔ "ندائے خلافت" اس موقع پر سورۃ البقرہ کی آیت ۲۶۵ کے مضمون میں سے یہ الفاظ آپ کی خدمت میں بطور ہدیہ پیش کرتا ہے: قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف!۔ OO

قیمت آٹھ روپے

الھدیٰ

سورۃ البقرہ

(آیات ۲۰۸-۲۰۹)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اے اہل ایمان' اللہ کی اطاعت میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ'

(کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی جزوی اطاعت ہرگز قبول نہ ہو گی۔ اگر تمہیں اللہ نے اس بات کی توفیق بخشی ہے کہ تم نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی گواہی دی ہے اور دائرہ اسلام میں تمہارا داخلہ ہو گیا ہے تو اب پورے کے پورے دین کو اختیار کرو' ایسا نہ ہو کہ تم اپنی زندگی کو مستقل طور پر مختلف حصوں میں تقسیم کر کے بعض حصوں میں اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کی پیروی کرو اور بعض دوسرے حصوں میں ان کے احکام کو یکسر نظرانداز کر دو۔ صحیح طرز عمل یہ ہو گا کہ تم کسی تحفظ اور استثناء کے بغیر اپنی پوری زندگی کو اسلام کے تحت لے آؤ۔ تمہارے خیالات و نظریات ہی نہیں تمہارے طور و اطوار اور اعمال و افعال بھی سب کے سب پورے طور پر اسلام کے تابع ہو جائیں' اور تمہاری انفرادی زندگی ہی نہیں پورا اجتماعی نظام بھی اللہ کے دین کی چھتری تلے آ جائے -------- جزوی اطاعت پر سخت ترین الفاظ میں تنبیہہ اور سرزنش اس سورۂ مبارکہ کی آیت نمبر ۸۵ میں گزر چکی ہے کہ مستقلاً یہ وطیرہ بنا لینا کہ دین کے بعض احکامات کی پیروی کی جائے اور بعض کو پاؤں تلے روند ڈالا جائے اللہ کی نگاہ میں اس درجے ناپسندیدہ ہے کہ اس کی نقد سزا تو دنیا کی زندگی ہی میں ذلت و رسوائی کی صورت میں مل جاتی ہے اور آخرت میں شدید ترین عذاب ایسے لوگوں کا مقدر ہو گا۔ اعاذنا اللہ من ذلک!)

اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو۔ یقیناً وہ تمہارا کھلا دشمن ہے ○

(دین کے حصے بخرے کرنا اور مستقل طور پر اسے مختلف حصوں میں تقسیم کر دینا اپنی حقیقت کے اعتبار سے شرک ہے۔ یہ وہ دام ہم رنگ زمیں ہے کہ جس کے حوالے سے انسانوں کو ورغلانا شیطان کے لئے سب سے آسان ہے۔ شیطان انسان کو پٹی پڑھاتا ہے کہ زندگی کے ہر معاملے میں دین و شریعت پر عمل کرنا کیا ضروری ہے۔ نماز روزے پر اگر کاربند ہو گئے تو یہ کیا کم ہے۔ آخر حقوق اللہ کا کھاتا تو کچھ نہ کچھ پورا ہو ہی گیا! باقی معیشت اور معاشرت کے معاملات میں تو زمانے کے چلن کو اختیار کئے بغیر چارا نہیں ہے' ان معاملات میں اس بحث میں پڑنا ہی غیر مناسب ہو گا کہ کیا حلال ہے اور کیا حرام' اور کیا جائز ہے اور کیا ناجائز!!----- شیطان کے اس بہکاوے میں آکر انسان خود اپنے آپ کو بھی دھوکہ دیتا ہے اور اپنے ضمیر کو بھی لوری دے کر سلانے کی کوشش کرتا ہے کہ چلو پورے دین پر نہ سہی' دین کے کچھ حصے پر تو ہم عمل پیرا ہیں' روزگار میں اگر حرام کی آمیزش ہو گئی تو کیا کریں کہ سود تو ایک مجبوری بن چکا ہے' آخر نمازوں' روزوں' حج اور عمروں کا یہ ڈھیر روز محشر ہماری نیکیوں کے پلڑے کو کچھ نہ کچھ جھکانے میں کامیاب تو ہو ہی جائے گا!!------- تو اے مسلمانو! دیکھنا شیطان کے اس فریب میں نہ آ جانا' وہ تمہارا ازلی دشمن ہے اور اس نے تو تمہیں راہ حق سے برگشتہ کرنے کا تہیہ کیا ہوا ہے۔ اس کی باتوں میں آ کر اپنی عاقبت تباہ نہ کر بیٹھنا!)

پھر اگر تم پھسل گئے اس کے بعد کہ صاف صاف ہدایات تمہارے پاس آ چکی ہیں تو جان رکھو کہ اللہ سب پر غالب' حکمت والا ہے ○

(کہ اتنی صاف صاف ہدایات' روشن تعلیمات اور واضح تنبیہات سامنے آنے کے بعد بھی اگر تم جادۂ حق سے بھٹک گئے اور تم نے اپنے ازلی دشمن ہی کی پیروی کی تو اچھی طرح جان لو کہ اللہ کی پکڑ سے تم کسی طرح بچ نہیں سکو گے' وہ سب پر غالب ہے اور کمال حکمت والا بھی!)

ترجمانی : حافظ عاکف سعید

جوامع الکلم

تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی خواہش نفس اس دین کے تابع ہو جائے جو میں لے کر آیا ہوں

(کہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے کے بعد اگر زندگی ان کی اطاعت کے سانچے میں نہیں ڈھل رہی تو اس ایمان کے کیا معنی! ایمان کی تکمیل اس کے بغیر نہیں ہو سکتی کہ انسان اپنی زندگی کے ہر ہر گوشے میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی عطا کردہ ہدایت کو مشعل راہ بنائے اور اپنی خواہشات نفس کو پورے طور پر اس کے تابع کر دے)

(الحدیث) (مشکوٰۃ المصابیح)

تاخلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لاکہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

تحریکِ خلافت پاکستان کا نقیب

ہفت روزہ
ندائے خلافت
لاہور

۲۵/ اکتوبر ۱۹۹۴ء

جلد ۳ شمارہ ۴۱

20

مدیر
اقتدار احمد

معاون مدیر
حافظ عاکف سعید

یکے از مطبوعات
تحریکِ خلافت پاکستان
۴ اے مزنگ روڈ۔ لاہور

مقامِ اشاعت
۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور
فون: ۸۵۶۰۰۳

پبلشر: اقتدار احمد طابع: رشید احمد چودھری

مطبع مکتبہ جدید پریس ریلوے روڈ لاہور

اس شمارے کی قیمت آٹھ روپے
قیمت فی پرچہ: -/۶ روپے
سالانہ زرتعاون (اندرون پاکستان) -/۱۲۵ روپے

زرتعاون برائے بیرون پاکستان
سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، بھارت ——— ۱۲ امریکی ڈالر
مسقط، عمان، بنگلہ دیش ——— " " "
افریقہ، ایشیا، یورپ ——— ۱ " "
شمالی امریکہ، آسٹریلیا ——— " " "

اداریہ

ہم کہاں "پڑے" ہیں؟

ہمارے قابل احترام دانشور صحافی اکثر اس عنوان کے تحت اپنی تشویش کا اظہار کیا کرتے ہیں جو ملک کے معروضی حالات اور قوم کے لچھن دیکھ کر انہیں لاحق رہتی ہے کہ "ہم کہاں کھڑے ہیں؟"۔ کاش' ان کا مشاہدہ اس حد تک ہی درست ہو تاکہ کسی نہ کسی مقام پر ہم کھڑے تو ہیں کیونکہ امر واقعہ تو یہ ہے کہ ہم پر قتیل شفائی کے مشہور فلمی گانے کا یہ بول صادق آتا ہے کہ "دل توڑنے والے دیکھ کے چل' ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں"۔ اپنے پیروں پر کھڑا ہونا تو نصیب ہی نہیں ہوا' دیسی اور بدیسی بیساکھیوں کے سہارے ہم نے چندے سربلند کر کے دیکھا بھی تو یہ قسم کھائے رکھی کہ قدم بڑھا کے نہ دیں گے یعنی زمین جنبد نہ جنبد گل محمد' اب خیر سے وہ بھی بھلے دنوں کی باتیں ہیں۔ موجودہ صورت حال تو یہ ہے کہ ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ کر چت پڑے ہیں' جو آئے ہم پر سے پھلانگ کر گزر جائے اور زمانہ اکیسویں صدی میں داخل ہونے کے لئے بڑھے تو جاتے ہوئے اتنی مہربانی ضرور کرے کہ ہمیں اپنی ٹھوکر پہ نہ رکھے۔ وہ اور ہوتے ہوں گے جو ٹھوکر کھا کر بدھ پاتے یعنی عقل کے ناخن لیتے ہیں' ہمیں تو ناحق تکلیف ہی ہو گی۔ یہ شاعری نہیں' عزیزو! حقیقت کا بیان ہے۔

طویل آمریت کے تسلط سے نکل کر جمہوریت نے ہمارے ملک میں جو قلابازیاں دکھائیں تو سمجھا یہ گیا تھا کہ کوا چلا ہنس کی چال' اپنی بھی بھول گیا اور اب پھر سے صحیح انداز میں چلنے کی کوشش کر رہا ہے تو کچھ نہ کچھ کمی بیشی تو گوارا کرنی ہی ہو گی۔ اپوزیشن کی حالیہ تحریک نجات اور حکومت کی جوابی شعبدہ بازی نے تو سادہ دل محبان وطن ہی کی نہیں' فکرمند اہل خرد کی بھی اصلاح احوال کے باب میں سب امیدوں پر پانی پھیر دیا ہے۔ لگتا یوں ہے کہ ہماری سیاست تماش بینوں میں گھر گئی بلکہ بچوں کے لئے ایک کھیل بن کر رہ گئی ہے۔ اور ذرا غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ "غزوۂ احزاب" لیلائے اقتدار سے وصل و فصل کا جھگڑا ہے ورنہ پاکستان کے اصل جواز اور اس کے استحکام کی واحد ضمانت یعنی اسلام کے بطور دین ملک میں نفاذ یا یوں کہہ لیجئے کہ نظام خلافت کا قیام ان میں سے کسی کو بھی مطلوب کیا' گوارا تک نہیں۔ دین و مذہب کے شعائر سے دونوں کو یکساں وحشت ہے' فرق صرف اس کے اظہار کے قرینے کا ہے۔ جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کو عوام کے استحصال کا کھلا موقع دونوں نے دیا اور آئندہ بھی دیں گے' چہرے صرف حالی موالیوں کے بدلیں گے جو باری باری پکی کچی ہڈیاں چچوڑتے ہیں' ملک کو دونوں جی بھر کے لوٹیں گے ندرت صرف طریق واردات میں ہو گی اور دونوں ہی وطن عزیز کے مفادات امریکہ بہادر کی وساطت سے صیہونیوں کے ہاں گروی رکھنے پر تیار ہیں مسئلہ محض یہ ہے کہ اس سودے میں پتی کسے ملے۔ ان دو متحارب فریقوں کی محاذ آرائی سے فائدہ اٹھا کر کئی سرپھروں نے "تیسری طاقت" بن کر سامنے آنے کی کوشش کی ہے تاکہ حصہ رسدی کچھ انہیں بھی مل جائے لیکن "وہ دن ہوا ہوئے کہ پسینہ گلاب تھا' اب عطر بھی ملو تو محبت کی بو نہیں"۔ عامتہ الناس کی عظیم اکثریت اس تیسری جنس سے بدک گئی ہے۔

ہمیں اقتدار کے وصل کا مزا لوٹنے والوں سے بھی ہمدردی ہے کہ بہار چند روزہ آخر تو چار دن کی ہے۔ حکومت کا نشہ اترے گا تو خمار ان کے بدن کو کیا کیا نہ توڑے گا۔ اقتدار کے ہجر میں رات کو تارے گننے اور دن میں تارے دیکھنے والوں پر بھی رحم آتا ہے کہ اللہ' ان کی محرومی کا مداوا کب ہو گا! اور ان مسخروں کی حرکتوں پر بھی ہنسنے کے بجائے رونے کو جی چاہتا ہے جو عوام کو متوجہ کرنے کے لئے نت نئے کرتب دکھاتے رہتے ہیں لیکن غریبوں کی سنی نہیں جاتی۔ اصل دکھ اور ملال اس بات کا ہے کہ "اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی" یعنی رجال دین سیاست کے افق سے بالکل ہی غائب ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس سانحہ کا الزام کسے دیں' مورد الزام وہ خود ہی تو ہیں۔ مسلمانوں کو دین کی طرف بلانے کے بجائے ان کی اکثریت نے لوگوں کا ہجوم خود اپنے گرد جمع کرنے کے لئے دین کو استعمال کیا اور پھر ان سے دین کے تقاضے پورا کرنے کا مطالبہ کرنے کے بجائے ووٹوں

کی بھیک مانگی۔ عوام کو ان کی خرابیوں کا احساس دلا کر اصلاح پر آمادہ کرنے میں ان کی طرف سے ناگواری کے اظہار کا خطرہ محسوس ہوتا تھا لہٰذا سارا قصور حکومتوں کے سر جڑ کر لوگوں کو صاف بری کر دیا۔ انبیاء کے جن وارثوں کا فرض لوگوں کو خبردار کر کے بندگی رب کے مقصد کی وحدت میں تسبیح کے دانوں کی طرح پرونا تھا' انہوں نے اپنے اپنے حصے کے بے وقوف جمع کرنے کے لئے فرقوں اور مسلکوں کی آڑ میں مسلمانوں کی اجتماعیت کو حصے بخرے کر دیا اور پارہ پارہ کر کے چھوڑا۔ ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ اب مذہبی اختلافات پر بھی "انارکی" اور "فسطائیت" کے لیبل لگنے لگے ہیں۔ بعض دینی سیاسی جماعتوں پر بھی "قبضہ گروپ" مسلط ہیں اور مذہب کا کوئی نہ کوئی عنوان رکھنے والے بعض گروہ ایک نئی قسم کا "مافیا" سمجھے جاتے ہیں۔

نتیجہ یہ ہے کہ ملک کے تعلیم یافتہ طبقے میں جو معاشرے کی ریڑھ کی ہڈی ہے اور ہماری خواہشات کے علی الرغم قوم کے معاملات جن کے ہاتھوں میں ہیں' رجال دین سے بیزاری کے باعث خود دین و مذہب سے ہی جان چھڑا لینے کی خواہش جڑ پکڑتی جا رہی ہے۔ شعائر دینی دن دہاڑے پامال کئے جا رہے ہیں اور بے خدا تہذیب کی بے روک ٹوک یلغار کے لئے تیز طرار مواصلاتی نظام قائم کئے جا رہے ہیں۔ اللہ سے تعلق اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن رحمت سے وابستگی کمزور پڑتے پڑتے معاشرے سے مٹتی جا رہی ہے اور دلوں کو اس بدترین محرومی کے احساس تک سے فراغت دلانے کے سو سو انتظام ہوتے نظر آ رہے ہیں۔ غرض دیکھتے ہی دیکھتے' ہمارے اپنے مسلمان معاشرے نے یوں رنگ بدلا ہے کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی۔ ایک طرف دینی و مذہبی جماعتوں' مسلکی گروہ بندیوں اور دین و مذہب کے نام پر قائم ہونے والے اداروں کی کثرت کا یہ عالم ہے کہ ایک اینٹ اٹھاؤ تو نیچے سے دو نکلتے ہیں اور دوسری طرف خود دین روز بروز اسلامی جمہوریہ پاکستان میں اجنبی ہوتا جا رہا ہے۔ یہ اذیت ناک نقشہ اس ملک کا ہے جو اسلام کے نام پر وجود میں آیا اور جس کی بقا کا واحد جواز آج بھی اسلام ہے لیکن کیا محض مرثیہ نگاری کافی ہے؟۔ کیا نوحہ غم ہمارے درد و الم کا مداوا بن سکتا ہے؟۔ نہیں' کچھ کئے ہی بات بنے گی۔

اللہ کی زمین کا یہ ٹکڑا جس کا نام پاکستان ہے' اللہ ہی کی مشیت کا خصوصی مظہر ہے۔ اس کا معجز نما قیام' ناسازگار ترین حالات میں اس کے وجود کا برقرار رہنا جس ناسازگاری میں اس کے اپنے باشندوں کی نالائقی و

(باقی صفحہ ۲۰ پر)

You are among brothers !

Welcome borthers Jamal Harwood, Farid Qasim, Nawaz Khan and Zulfikar Shah Nawaz from London representing HIZB-ut-TEHRIR of England. You are among your comrades working for establishment of the order of KHILAFAH in this part of the World. Pakistan was carved out of the map of Indian sub-continent in the name of Islam and ours is the only typical country on the globe whose identity is ISLAM and ISLAM alone. We have tried to study your methodology and you are cordially invited with love and affection to examine our approach which we call "MANHAJ-e-INQILAB-e-NABAVI" and claim having directly derived it from Quran and the Sunnah.

May Allah (S.W.T) make the time spent by you with us benificial for both sides and fruitfull for the cause of global advancement of Islamic movements and resultant domination of Islam as a Deen which actually means restoration of international Khilafah. A'min.

Editor, Nida-e-Khilafat, Lahore

ہے ایک ہی نغمہ' کہیں اونچا کہیں مدھم

"ندائے خلافت" ان محترم زعمائے قوم کو بھی خوش آمدید کہتا ہے جو اپنی مصروفیات میں سے وقت نکال کر تنظیم اسلامی کے رفقاء اور اس کی تحریکِ خلافت کے معاونین کو اپنے نتائج فکر اور اپنے لائحۂ عمل سے براہِ راست آگاہ کرنے کی ہماری دعوت کو قبول کرتے ہوئے ہمارے سالانہ اجتماع میں تشریف لائے ہیں۔ یہ بظاہر ایک غیر معمولی واقعہ ہے کیونکہ کوئی بھی جماعت یا تنظیم بلکہ انجمن یا ادارہ بھی شب و روز کی محنت کے بعد جمع کئے ہوئے اپنے متعلقین کو اپنے بس پڑتے تو دوسری جماعتوں کے رہنماؤں کے سامنے پیش نہیں کیا کرتی کہ چاہیں تو اثر بھی قبول کر لیں لیکن ہمارا غیر روائتی اقدام اس اعتماد کا مظہر ہے کہ جتنے گروہ پاکستان میں غلبۂ دین کے لئے کام کرتے ہوئے ملک میں مروج سیاسی کلچر کی غلاظت سے دامن بچائے ہوئے ہیں' وہ سب ہمارے فطری حلیف ہیں۔ ہم سب کی منزل ایک ہے' اس کی طرف جانے والا سیدھا اور صاف راستہ بھی ہمارے نزدیک تو وہی ایک ہے جو ہمارے قائد نے قرآن حکیم کی رہنمائی میں سیرت مطہرہ سے اخذ کیا ہے تاہم آپ نے اپنی بصیرت سے جس طریقے کو صائب جانا اس پر بھی ہم ان شاء اللہ جماعتی عصبیت کی ہر نوع سے شعوری طور پر بچنے کی کوشش کرتے ہوئے غور کریں گے۔ اللہ تعالیٰ دین کے لئے ہم سب خلوص میں برکت ڈالے۔ آپ بھی ہماری تحریک کے لائحہ عمل کا تجزیہ فرمائیں' اس کے کمزور پہلوؤں کی طرف ہمیں متوجہ کریں اور اس کے مضبوط اجزاء کی تصویب فرما کر اپنے ہاں بھی اسے اختیار کر لیں---- اور بہر صورت ہمیں اپنی دعاؤں میں ضرور یاد رکھئے!

بس یہی واحد طریقہ ہے جس سے ایک ہی نقطہ کی طرف رخ کر کے آگے بڑھنے والے سب متوازی یا آڑے ترچھے خطوط بہت جلد باہم ایک دوسرے میں مدغم ہو جائیں گے اور ان شاء اللہ آ ملیں گے سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک!--OO

عَنِ الحَارِثِ الاشعری، قَالَ، قَالَ رسُولُ اللهِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَسَلَّمَ

"اٰمُرُکُمْ بِخَمْسٍ

بِالجَمَاعَةِ والسَّمعِ والطَّاعَةِ والهِجْرَةِ والجِهَادِ فِی سَبِیلِ اللّٰہِ"

اپنی اس اجتماعیت کی قدر پہچانئے: سالانہ اجتماع کے موقع پر ایک رفیقِ تنظیم اسلامی کی توجہ طلبی

نثار احمد ملک

فکر کی آپ کو میسر نعمت اب جنسِ نایاب ہے

آج فکر و عمل کی روشنی پھیلانے کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ ہے

تنظیمِ اسلامی پاکستان کا انیسواں سالانہ اجتماع ۲۱/اکتوبر سے شروع ہو رہا ہے۔ اس چھوٹے سے قافلہ سے وابستہ افراد ایک اعلیٰ مقصد کے حصول کی تڑپ اپنے سینوں میں لئے نجانے کہاں کہاں سے چلے آرہے ہیں۔ آج کا یہ کالم میں اپنے انہی ہمسفروں کی نذر کر رہا ہوں لیکن ڈرتے ڈرتے۔ تنظیم اسلامی میں نہ شخصیت پرستی کی گنجائش ہے اور نہ ہی جماعت پرستی کی' چنانچہ اپنے بزرگوں اور ساتھیوں سے خائف ہوں کہ نجانے کس بات پر بازپرس کر بیٹھیں۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب بات اپنے قائد کے افکار و نظریات اور کردار کی ہو رہی ہو تو قلم کا غیر متوازن ہو جانا کوئی بعید از قیاس نہیں ہے۔

میرے ساتھیو! آپ یقیناً اس چھوٹے سے قافلے میں پورے شعور کے ساتھ شامل ہوئے ہیں لیکن آپ کو معلوم بھی ہے کہ تنظیمِ اسلامی اور اس کے قائد نے ہمیں کیا دیا ہے؟ آج جب کہ درجنوں جماعتیں اور جمعیتیں اپنے اپنے انداز میں بظاہر اللہ کے دین کے کام میں کوشاں ہیں' آخر آپ نے تنظیم اسلامی کو ہی کیوں منتخب کیا؟ ان سطور میں انہی دو سوالات کا جواب دے رہا ہوں اگر انہیں میری طرف ہی لوٹا دیا جائے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا آج درجنوں جماعتیں دین کے نام پر موجود ہیں۔ ہر جماعت کا یہی دعویٰ ہے کہ اصل کام تو وہی ہے جس کا بیڑا ہم نے اٹھایا ہے۔ گویا ان کا طرزِ فکر یہ ہے کہ ہم چو ما دیگرے نیست! جن لوگوں کو بھی اس ماحول میں کام کرنے کا موقع ملتا ہے وہ اس طرزِ فکر کے حاملین سے بخوبی آگاہ ہیں۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ طرزِ فکر کچھ اتنا غلط بھی نہیں۔ اس لئے کہ وہ جو کام کر رہے ہیں' حق جان کر ہی تو کر رہے ہیں تو پھر ان کا یہ دعویٰ غلط کیسے ہو جاتا ہے۔ میں عرض کروں گا کہ یہ طرزِ فکر بطورِ خود تو غلط نہیں' تب غلط ہو جاتا ہے جب آپ دوسروں کی خدمات اور کام کو تسلیم کرنے کا حوصلہ نہ پاکر یکسر مسترد کردیں۔ اب آپ اس ماحول میں اگر اپنے قائد کے افکار و نظریات اور اپنی جماعت کے مزاج پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں تو آپ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں گے کہ ہم چھوت کے اس جماعتی مرض سے محفوظ مامون ہیں۔ تنظیم اسلامی کے رفقاء کی تربیت ہی اس نہج پر کی جاتی ہے کہ دوسروں کو نہ صرف برداشت کرنے کا حوصلہ پروان چڑھے بلکہ دوسروں سے جو خیر کسی بھی پہلو سے پھیل رہا ہے' اس کو تسلیم کرنے کی خو بھی پختہ ہوتی چلی جائے۔ اگر کچھ لوگوں نے اپنے آپ کو علمی میدان کے لئے وقف کر رکھا ہے تو یقیناً اس سے بھی اسلام کا ہی بھلا ہوگا اور اگر کچھ لوگوں نے بدعات و رسومات کے خلاف کوئی مثبت محاذ بنا رکھا ہے تو یہ بھی دین ہی کی ایک خدمت ہے۔ ہمیں اگر اپنے ان بزرگوں سے اختلاف ہے تو صرف اس بات پر کہ بھلے لوگو! یہ نہ کہو کہ ہم ہی دین کے اجارہ دار ہیں اور یہ دین ہماری محنتوں سے ہی بچا ہوا ہے اور یہ فلاں فلاں تو ہیں ہی گمراہ لہٰذا ان کی خدمت دین چہ معنی دارد! رفقاء گرامی ذرا انصاف سے بتانا کہ یہ رواداری اور توازن ایک نعمت سے کیا کم ہے؟۔

رفقاء محترم! اب میں آپ کی توجہ فکری افراط و تفریط کے ایک دوسرے خطرناک گوشے کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ یہ افراط و تفریط اپنے اسلاف کے بارے میں ہماری محبت و نفرت کے حوالے سے ہے۔ اس حوالے سے بھی آپ کو اکثر و بیشتر انتہا پسندانہ نقطہ ہائے نظر سے ہی واسطہ پڑتا ہے۔ چنانچہ آپ کو کچھ ایسے لوگ بھی مل جائیں گے جو ابھی تک قیامِ پاکستان کے دکھ کو نہیں بھلا سکے' اس لئے کہ ان کے بزرگوں کی آراء کے علی الرغم بیسویں صدی میں عالمِ اسلام کی یہ عظیم مملکت وجود میں آگئی۔ انہوں نے اپنی زندگی کا وظیفہ یہ ٹھہرالیا ہے کہ اٹھتے بیٹھتے' موقع بے موقع جناح اور اقبال کو آڑے ہاتھوں لو! گویا اب ان کا فرض اتنا ہی رہ گیا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزادؒ اور مولانا مدنیؒ کا قصیدہ پڑھ لیا جائے اور جناح اور اقبال کو کوس لیا جائے۔ ہمارے ان بزرگوں کی کل تحقیق کا زور اس نقطے پر مجتمع ہو جاتا ہے کہ جناح اور اقبال کی شخصی کمزوریوں پر مبنی روایات کو

حدیث رسول ﷺ

عن
عُبادۃ بن الصامت رضی اللہ عنہ
قال: بایعنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
علی السمع والطاعۃ
فی العسر والیسر
والمنشط والمکرہ
وعلی اثرۃ علینا
وعلی ان لا ننازع الامر اھلہ، الا ان تروا کفرا بواحا
عندکم فیہ من اللہ برھان،
وعلی ان نقول بالحق اینما کنا، لا نخاف فی اللہ
لومۃ لائم
(بخاری ومسلم)

اکٹھا کیا جائے اور اس فانی جہان کو چھوڑ جانے کے بعد بھی ان کی ان خطاؤں کو معاف نہ کیا جائے جو شائد وہ رب غفور و رحیم بھی معاف کر چکا ہو۔ پھر ہمارے یہ بزرگ کہتے ہیں کہ پاکستانی قوم ہمارے بزرگوں کا احترام نہیں کرتی۔ ہم ان سے عرض کرتے ہیں کہ جب آپ بارہ کروڑ عوام کے مسلمہ اکابرین کے احترام کی روش ترک کئے ہوئے ہیں تو آپ کے متنازع بزرگوں کا احترام کون کرے گا؟۔

رفقاء گرامی' یہ فکری عدم توازن کی ایک انتہا ہے۔ جبکہ دوسری طرف آپ دیکھیں گے کہ ہماری عظیم اکثریت کی حالت یہ ہے کہ وہ ابھی تک ابوالکلام آزادؒ اور شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کے اس "جرم" کو معاف نہیں کر سکی کہ قیام پاکستان کے وقت ان کا نقطۂ نظر مسلم لیگ اور جناح سے مختلف تھا۔ یہ بات میں صرف عوام کی نہیں' دانشوروں اور تاریخ نویسوں کی کر رہا ہوں جنہیں مولانا مدنیؒ کے علم و فضل اور تقویٰ و تدین سے بھی حیاء نہیں آتی۔ ان کی حالت یہ ہے کہ وہ ابوالکلام سے سیاسی اختلاف میں اس قدر اندھے ہوگئے ہیں کہ ان کی علمی و فکری رفعت سے بھی انکاری ہیں۔

اسلام کے بارے میں محبت و نفرت کی انتہا یہ ہے کہ کچھ لوگ یہ بات بڑے فخر سے کہہ دیتے ہیں کہ میں ابوالکلام کا اندھا مقلد ہوں! کچھ لوگوں نے کٹر حنفیت اور دیوبندیت کے دعوے کر رکھے ہیں۔ گویا وہ کل حق کو دیوبندیت اور حنفیت میں محصور سمجھے بیٹھے ہیں۔ رفقاء گرامی! آپ کو اپنے ماحول میں "خادمین دین" کی ایک عظیم اکثریت ایسی بھی ملے گی جو صبح و شام مولانا مودودیؒ کو "مردودی" اور نجانے کن کن القابات سے یاد فرما کر اپنے لئے بلندی درجات کا ساماں کرتے ہیں۔ بات انہی پر ختم ہوجاتی تو پھر بھی خیر تھی' دوسری طرف سے فکر مودودی یہ ٹھہرا کہ مولانا مرحوم و مغفور نے جو کچھ کہہ دیا ہے' وہ حرف آخر! مولانا کے خلاف لکھے جانے والے ہر حرف کا جواب فکر مودودی کے وارثوں نے اپنے اوپر لازم ٹھہرالیا۔ گویا مولانا مودودی سے بھی بھلا کوئی فکری خطا ممکن ہے؟۔

میرے ہمسفرو! ایسے ماحول میں جبکہ ہر طرف شخصیتوں کے بت تراش کر سجالئے گئے ہوں اور ان بتوں کی پرستش مسلک کے شعائر اور عقیدے کے اجزاء میں شامل ٹھہرے' کسی متوازن راہ کا مل جانا غنیمت ہے کہ نہیں۔ میں جب اس سارے "مذہبی کلچر" کا مطالعہ کرنے کے بعد اپنے امیر کے افکار پر نظر دوڑاتا ہوں تو نجانے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں روشنیوں کے کتنے چراغ ہیں کہ جو روشن ہوجاتے ہیں۔ مجھے جناح کے مقام کا بھی صحیح تعین مل جاتا ہے' مجھے انقلابی فکر کی تکمیل میں ابوالکلام آزاد کے Contribution کا بھی اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہوتی' مجھے شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کے مجاہدانہ کردار کا بھی ادراک ہوجاتا ہے' میں اقبال کی فکری بلندیوں سے آگہی حاصل کرنے میں بھی ٹھوکر نہیں کھاتا اور مجھے یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ اسلامی نظام حیات کی تدوین نو میں مولانا مودودیؒ کے قلم کی جولانیاں بھی اپنا مماثل نہیں رکھتیں۔ مجھے کسی کو کوسنے اور کسی کی اندھی تقلید کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی بلکہ ان سب بزرگوں کی طرف سے آنے والے علم و حکمت اور حرکت و عمل کے چشموں کے سے سیراب ہونے کی فکر دامن گیر رہتی ہے۔ انقلابی فکر کی ترویج میں ان کی قربانیوں کی تدریج پر ان کے لئے اٹھتے بیٹھتے دعا نکلتی ہے' اس لئے کہ اگر وہ اس فکری سرمائے اور عملی خطوط کو ہم تک نہ پہنچاتے تو شائد ہم آج اتنی آسانی سے انشراح صدر کے ساتھ آگے نہ بڑھ سکتے۔

جیسا کہ میں نے شروع میں کہا کہ' ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ سب کچھ آج ہی ہم پر منکشف ہوا۔ لیکن یہ ضرور کہیں گے کہ اس انقلابی فکر میں نکھار' جس قدر امیر محترم مدظلہ نے پیدا کیا ہے' اس قدر پہلے نہ تھا۔ چنانچہ اس حوالے سے چند مثالیں آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ فرائض دینی کا تصور آپ کو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے لٹریچر میں بھی مل جائے گا لیکن اسے آپ کو ہزاروں صفحات پر پھیلی ہوئی تحریروں میں سے خود محنت و کوشش کرکے اخذ کرنا ہوگا جبکہ امیر محترم نے فرائض دینی کے جامع تصور کو دو اور دو چار کی طرح' ڈایاگرام کی مدد سے غیر مبہم انداز میں قرآن و سنت کے مضبوط دلائل کی روشنی میں واضح کردیا ہے۔ یہ تصور نہ صرف واضح کیا بلکہ اپنے رفقاء کو رٹوا بھی دیا ہے۔

اسی طرح آپ کو فکری اعتبار سے یہ امتیاز بھی صرف تنظیم اسلامی اور اس کے امیر کے ہاں ہی ملے گا کہ انقلابی عمل کے تمام مراحل کو' ان کے پورے تقاضوں کے ساتھ بیان کردیا۔ میں اپنے حقیر سے مطالعہ کی روشنی میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ اسلام کے انقلابی فکر کی تدریج میں ان تمام مراحل کی مکمل وضاحت پہلی مرتبہ امیر محترم مدظلہ کے ذریعے سے ہوئی ہے۔ میں یہ تو ہرگز نہیں کہتا کہ اب اس میں کسی تبدیلی یا اضافے کی گنجائش نہیں ہے کیونکہ اس بات کا

قوی امکان موجود ہے کہ آنے والے پیش آمدہ نئے حالات کی روشنی میں اس کو اس سے بھی بہتر انداز میں پیش کرسکیں لیکن یہ میں ضرور کہوں گا کہ ان فکری خطوط کو پھلانگ کر انقلابِ اسلامی کے لئے کوئی نئی راہ نکالنا شائد مشکل ہو۔ اس حوالے سے بھی آپ اگر معاصر تحریکوں سے اپنا موازنہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ صرف اسلامی انقلاب کے "نعرہ" سے واقف ہیں' اس انقلابی عمل کے مراحل و مدارج سے وہ یکسر ناواقف ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس رفقاء تنظیم اسلامی نے ان مراحل کو فکری سطح پر خوب اچھی طرح ہضم کرلیا ہے۔

رفقاء محترم' تنظیم اسلامی کی فکر کا ایک امتیازی پہلو یہ بھی ہے کہ دوسری جماعتوں کے برعکس یہاں نصب العین کی دوئی نہیں ہے۔ امیر تنظیم اسلامی نے اس بات کو رفقاء کے قلوب و اذہان میں خوب اچھی طرح اتار دیا ہے کہ ہمارا نصب العین فقط اللہ کی رضا جوئی ہے۔ جبکہ اس کے برعکس اکثر جماعتوں نے نصب العین کی دوئی کو یہ کہہ کر برقرار رکھا کہ ہمارا نصب العین اقامت دین اور اللہ کی خوشنودی ہے۔ ہمارے قائد نے بظاہر اس باریک لیکن نتائج کے اعتبار سے بہت ہی گہرے فرق کا ادراک اچھی طرح کرلیا۔ چنانچہ ان کا کہنا یہ ہے کہ اقامت دین کی جدوجہد ہمارا دینی فرض ہے جبکہ اس جدوجہد کی غرض و غائت حصول رضائے الٰہی کے سوا کچھ نہیں۔ اب آپ خود سوچئے کہ جس کے قلب و ذہن میں یہ حقیقت ثبت ہوجائے' کیا وہ بھی صبح و شام کی اپنی محنت کو بظاہر ثمرآور ہوتے نہ دیکھ کر دل ہار کر بیٹھ جائے گا؟ کیا وہ نصب العین تک پہنچنے کے لئے الٹے سیدھے طریقے بھی ایجاد کرے گا؟۔ کیا وہ اقامت دین کے لئے خود دین کو قربان کردینے کا متحمل ہوسکے گا؟۔ یقیناً آپ کا جواب نفی میں ہوگا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک اور سوال میں آپ سے یہ بھی کروں گا کہ کیا اس اعلیٰ نصب العین کے واضح ہوجانے کے بعد بھی اسے اپنی صلاحیتوں کے کچھ حصے کو بچاکر رکھنا چاہئے؟۔

تنظیم اسلامی نے روحانی ترفع کے لئے بھی جو فکر دیا ہے وہ بہت ہی متوازن ہے۔ امیر محترم مدظلہ نے روحانی ترفع کے خانقاہی تصور کے برعکس قرآن و سنت پر مبنی فکر کو "تقرب بالفرائض اور تقرب بالنوافل" کے زیر عنوان بیان کیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ امت کی وہ عظیم اکثریت جس کا دین اسلام کے مذہبی گوشے سے کسی بھی درجے میں کوئی تعلق ہے' اپنے فرائض کی ادائیگی سے یکسر غافل ہے لیکن نوافل کے ڈھیر جمع کر رہی ہے۔ نوافل کی اہمیت اس قدر کیوں ہوگئی؟۔ اس کا ایک طویل تاریخی پس منظر ہے جس سے رفقاء تنظیم یقیناً واقف ہوں گے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب اسلام مغلوب ہوگیا اور اس کے غلبے کے لئے کی جانے والی کوششیں ناکامی سے دوچار ہوئیں بلکہ ان کا جاری رکھنا بھی ناممکنات میں شامل ہوگیا تو ان حالات میں علماء و صوفیاء کی اکثریت نے اقامت دین کی جدوجہد سے اپنے آپ کو الگ کرلیا اور اپنے اور عوام کے ایمان کو بچانے کے لئے خانقاہوں کی پناہ ڈھونڈی۔ آہستہ آہستہ عوام نے نماز روزہ کو ہی فرض سمجھ لیا اور اگر کہیں دینی جذبہ زیادہ بے باک ہوا تو اس کو تصوف کے راستے نوافل پر لگادیا گیا۔ آج جب کہ دین مغلوب ہے' اصل اہمیت فرائض کے ذریعے تقرب حاصل کرنے کی ہے۔ یہاں میں یہ بات واضح کرتا جاؤں کہ امیر محترم مدظلہ انفرادی سطح پر نوافل کی کثرت کو مستحسن سمجھتے ہیں لیکن کسی اجتماعیت کا اس رنگ میں اس قدر رنگ جانا کہ اقامت دین کی جدوجہد کی حیثیت ثانوی اور سلوک کی منازل طے کرنے کی حیثیت پہلی ہوجائے' ہرگز مطلوب نہیں ہے۔ ان دونوں چیزوں میں فرق کرنا ضروری ہے۔ ایک ہے انفرادی سطح پر تہجد میں کھڑے ہوکر قرآن کو اپنے قلب پر اتارنا کہ یہ روحانی ترفع اقامت دین کی جدوجہد میں ممد و معاون ثابت ہو جبکہ پوری اجتماعیت کو چلوں' مراقبوں اور نوافل کے ڈھیروں کے نیچے دفن کردینا بالکل الگ چیز ہے۔ امیر محترم مدظلہ نے اس فرق کو خوب اچھی طرح واضح کیا ہے۔

رفقاء محترم! اب میں تنظیم اسلامی کے تربیتی نظام اور آزادی اظہار رائے کے حوالے سے چند نمایاں پہلوؤں کی نشاندہی کروں گا۔ آپ کو اور مجھے بھی یقیناً ایک بات کا کسی بھی درجے میں شکوہ ضرور رہا ہے کہ ہمارے امیر جلالی مزاج کے حامل ہیں۔ آپ کو یقیناً امیر محترم کی ڈانٹ ڈپٹ کا کسی نہ کسی موقع پر سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ یہ امیر محترم مدظلہ کی بقول خود ایک شخصی کمزوری ہے۔ لیکن میں اس وقت اس حقیقت کے ایک دوسرے پہلو کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ امیر محترم کے مزاج کی سختی کے باوجود اپنے آپ کو ہر مناسب فورم اور موقع پر آپ کے سامنے احتساب کے لئے پیش کیا ہے۔ مجھے بتائیے کہ ہم نے کبھی اپنے امیر کے ساتھ رعایت کی ہے؟۔ کیا ہماری تنقیدوں کو امیر محترم مدظلہ نے گھنٹوں بڑے تحمل اور حوصلے کے ساتھ نہیں سنا؟۔ آپ یقیناً کہیں گے کہ سنا ہے۔ لیکن میں اس وقت جو بات آپ پر واضح کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ یہ روایت آپ کو صرف تنظیم اسلامی میں ہی ملے گی۔ میں چونکہ خود مختلف جماعتوں سے ہوتا ہوا تنظیم اسلامی تک پہنچا ہوں' اس لئے عرض کر رہا ہوں کہ جماعتوں کے قائدین کے رویئے' ان کا کردار زیر بحث آتا ہی نہیں ہے۔ کم از کم یہ تو کہا جاسکتا ہے کہ عام ارکان کے لئے کوئی فورم نہیں ہوتا کہ وہ اپنے امیر پر تنقید کرسکیں' شائد شوریٰ میں ایسا ہوتا ہو۔ اس کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان ارکان کی تربیت ہی اس طرح کی جاتی ہے کہ ان کے ذہن میں بھی یہ بات سماتی ہی نہیں کہ اپنے امیر پر بھی تنقید کی جاسکتی ہے۔ وہاں تو قائدین کے ہاتھ چومے جاتے ہیں۔ گویا ارکان کے دلوں کو عقیدت کے تیروں سے پہلے ہی اس قدر گھائل کردیا جاتا ہے کہ تنقید کا خیال ابھرنا ہی محال ہوتا ہے۔

اسی طرح آپ نے اس بات کا بھی یقیناً مشاہدہ کیا ہوگا کہ جماعتیں اپنے ارکان کو دوسروں کی "نظربد" سے بچاکر رکھتی ہیں کہ کہیں کسی کے سحر کا اثر نہ ہوجائے! چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ طلباء کی ایک ایسی جماعت جس کی بنیادوں میں امیر محترم نے اپنی جوانی کا خون ڈالا تھا' اس غزل سرا کو کبھی اپنے چمن میں نہیں آنے دیتی' مبادا کسی کے دل میں شہد کے میٹھے قطروں کی طرح قرآنی فکر اتر جائے اور وہ اپنی راہ الگ کرلے۔ اس کے برعکس تنظیم اسلامی کے امیر نے متعدد مواقع پر اپنی برسوں کی کمائی دوسرے قائدین کے سامنے لاکر رکھ دی کہ یہ ہیں میرے جان نثار' ان پر میری فکری کجی کو واضح کرکے ان کی اور میری رہبری کا فریضہ ادا کیجئے۔ رفقاء محترم' اسی طرح کا ایک موقع آپ کے قائد نے دوسری جماعتوں کے بزرگوں کو اب کی بار بھی دیا ہے۔ مجھے بتائیے کہ ایسی ریت آپ کو کہیں اور بھی نظر آتی ہے۔ گویا آپ کے اور میرے امیر نے نہ صرف زبانی بلکہ عملی طور پر یہ بات ثابت کردی کہ جس نے میرا ساتھ دینا ہے وہ علیٰ وجہ البصیرۃ دے۔

تنظیم اسلامی کی دوسری جماعتوں کے مقابلے میں ایک امتیازی خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ فکرِ قرآنی پر اٹھنے والی تحریک ہے۔ اس ضمن میں بھی میں عرض

(باقی صفحہ ۱۶ پر)

کیا پاک چین دوستی دشمنی میں بدل جائے گی؟

فیاض اختر

یوں تو پاکستان کی سالمیت کے خلاف ہندوستان اور مغربی اقوام کی یلغار روز اول سے ہی جاری ہے جس میں پاکستانی ملت فروشوں نے بھی کسی قسم کی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ مغرب کے ان داخلی گماشتوں کے نمایاں ہتھیار فحاشی و عریانی' فرقہ واریت' اسلحہ اور منشیات کی لعنت شامل ہیں اور اس بات کا اعتراف کیئے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ مذکورہ بالا سازشوں میں دشمن بھرپور کامیابی حاصل کرچکا ہے' جس کا سہرا بجا طور پر ہر حکومت میں موجود ملت فروشوں کے سر جاتا ہے کہ جنہوں نے چند ٹکوں کے عوض نہ صرف دشمن کی ہر سازش کو کامیاب بنایا ہے بلکہ تاحال بڑی ہوشیاری سے وطن عزیز کی جڑیں کھودنے میں مشغول ہیں۔ اس کا واضح ثبوت حال ہی میں پاک چین دوستی میں بڑھتی ہوئی خلیج ہے۔

چین پاکستان کا نہ صرف عظیم ہمسایہ ہے بلکہ ایک عظیم دوست بھی ہے۔ اس نے اگر ہر آڑے وقت میں پاکستان کی بھرپور امداد کی تو جواباً پاکستان نے بھی چین کو دنیا میں اس کا جائز مقام دلانے میں بھرپور کردار ادا کیا۔ یہ بقائے باہمی کا جذبہ ہی تھا جس نے پاک چین دوستی کو پوری دنیا میں ضرب المثل بنادیا تھا۔ خصوصی طور پر کشمیر کے مسئلہ پر چین نے ہر سطح پر پاکستانی مؤقف کی بھرپور حمایت کی ہے۔ یہی وہ پس منظر تھا کہ جس کی بنا پر اہل پاکستان کو اس وقت شدید ذہنی صدمہ سے دوچار ہونا پڑا جب عالمی انسانی حقوق کمیشن کے روبرو چین نے کشمیر کاز پر اپنی حمایت سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اگرچہ دونوں ممالک کے عوام کے لئے یقیناً یہ ایک غیر متوقع صورت حال تھی مگر یہ صورت حال بلاسبب ہرگز نہیں تھی بلکہ دونوں ممالک کی سلامتی کے خلاف اس عظیم سازش کا حصہ ہے جس کا دوسرا سرا نیو ورلڈ آرڈر کی زہریلی زنجیر سے منسلک ہے۔

اس وقت پوری دنیا کو فکری و عملی سطح پر غلام بنانے کی مکروہ سازش زوروں پر ہے' جس کے مؤثر ترین ہتھیار پراپیگنڈا اور بینکنگ سسٹم ہے۔ گویا نیو ورلڈ آرڈر سے موسوم ایک ایسا عفریت ہے جس کا جسم و بازو تو امریکہ اور اس کے حواری ہیں جبکہ اس کو کنٹرول کرنے والا دماغ یہودی ہیں' جو پوری دنیا میں اپنی بالادستی کے خواب دیکھ رہے ہیں۔

ایک طرف جہاں ستائیس رمضان المبارک کو اسلام کے نام پر وجود میں آنے والی عظیم مملکت پاکستان جس کے پاس دنیا کی بہترین تربیت یافتہ فوج ہے بلکہ حال ہی میں اللہ تعالٰی کے خصوصی فضل سے ایٹمی صلاحیت حاصل کرلینے کے بعد مسلم ممالک میں امریکہ اور یہودیوں کی نظر میں سب سے زیادہ کھٹک رہا ہے تو دوسری طرف سطح زمین پر چین وہ واحد ملک رہ گیا ہے جو نیو ورلڈ آرڈر کی راہ میں رکاوٹ بن سکتا ہے بلکہ بن رہا ہے۔ لہٰذا یہی وجہ ہے کہ امریکہ ان دونوں ممالک کو خصوصی طور پر اور ایران' ہندوستان اور مشرق وسطیٰ کی نو آزاد ریاستوں کو عمومی طور پر پہلے کمزور اور پھر زیر نگیں لانے کے لئے ان سب کے مرکز میں ایک ایسے خطہ کی ضرورت محسوس کرتا ہے کہ جس کو وہ "مستقر" بناکر اپنی سازش کو عملی جامہ پہنا سکے۔ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ان مقاصد کے حصول کے لئے ان کی نگاہ انتخاب نے کشمیر کو چن لیا ہے' جو کہ نہ صرف جغرافیائی اعتبار سے بلکہ زمینی ساخت اور موسم کے اعتبار سے بھی آئیڈیل ہونے کے علاوہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان متنازعہ بھی ہے۔

ان حالات و واقعات کے صغریٰ کبریٰ کو جمع کیا جائے تو امریکی منصوبہ کچھ اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ اپنے طفیلی ادارہ اقوام متحدہ کے ذریعہ بندر بانٹ کا تماشہ دکھانا چاہتا ہے جس کے نتیجہ میں بلیاں نہ صرف محروم رہ جائیں گی بلکہ اپنی سلامتی کے ساتھ ساتھ پورے علاقہ کی سلامتی بھی داؤ پر لگا دیں گی۔ اس لئے کہ امریکی ثالثی کے نام پر کشمیر پر قبضہ کرکے فوجی و ایٹمی اسلحہ کا ایک بہت بڑا اور مضبوط اڈہ قائم کرنا چاہتا ہے۔ لیکن یہ امر انتہائی افسوسناک ہے کہ موجودہ حکومت روز اول ہی سے اقوام متحدہ کی ثالثی پر آمادگی کا اظہار کرتی آرہی ہے۔ یہ بات اس کی حب الوطنی کو مشکوک بنا رہی ہے جبکہ اس کے مقابلہ میں ہندوستان کی حکومت نے امریکہ یا نام نہاد اقوام متحدہ کی ثالثی سے صاف انکار کردیا ہے۔ گویا کہ اللہ تعالٰی پاکستان کے دشمن ہی سے اس کی حفاظت کا کام لے رہا ہے جبکہ اپنے اس کو گنوانے پر تلے ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں چین کا جھکاؤ اس اندیشہ کی بنا پر کہ پاکستان کی زمین اس کی سلامتی کے خلاف استعمال ہو رہی ہے' ہندوستان کی جانب جا رہا ہے' جس کے نتیجہ میں دونوں ممالک کے مابین نہ صرف دیرینہ دشمنی ختم ہو چکی ہے بلکہ خیر سگالی اور دوستی کو تقویت دینے کے لئے کئی معاہدے بھی عمل میں آچکے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہندوستانی افواج کا ایک بڑا حصہ جو اس نے ممکنہ چینی حملہ سے بچنے کے لئے چین کی سرحدوں پر جمع کر رکھا تھا' وہاں سے ہٹا کر پاکستانی سرحدوں پر لا بٹھایا ہے۔ یہ جہاں ہندوستان کی ایک عظیم کامیابی ہے وہیں پاکستان کی بہت بڑی ناکامی بھی ہے۔

ہو سکتا ہے اس کوتاہی کی بڑی وجہ حکومت اور اپوزیشن کے درمیان کھینچا تانی ہی ہو مگر ضرورت اس بات کی ہے کہ تعلقات کو مزید بگڑنے سے فوری طور پر روکا جائے' جس کی بہترین صورت ایک طرف تو یہ ہو سکتی ہے کہ امریکہ اقوام متحدہ یا کسی بھی یورپی ملک کی ثالثی کسی صورت میں قبول نہ کی جائے بلکہ اس کا واشگاف اعلان کیا جائے کہ ہمیں اس طرح کی کسی ثالثی کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ دوسری طرف چین کو یہ یقین دلا دیا جائے کہ پاکستان کی سرزمین اس کی سالمیت کے خلاف ہرگز استعمال نہ ہوگی کیونکہ ممالک کے درمیان رشتے باہمی سلامتی اور مفاد کی بنیاد پر ہی ہوتے ہیں اور اگر ہم اپنے عظیم ہمسایہ کو یہ اطمینان نہ دلا سکے تو اندیشہ ہے کہ چین نہ صرف پاکستان کی دوستی سے دستبردار ہو جائے گا بلکہ آگے چل کر اپنی سالمیت کی بنیاد پر دشمنی پر بھی آمادہ ہو جائے گا جس کے لئے ہندوستان بھرپور جدوجہد کر رہا ہے۔ اگر خدانخواستہ ہم ہزاروں میل دور بیٹھے امریکہ جیسے ناقابل اعتبار ملک کے ہاتھوں میں کھلونا بنتے رہے تو عین ممکن ہے کہ چین ہندوستان اور ایران پر مشتمل ایک بلاک وجود میں آجائے اور ہندوستان کو پاکستان پر فوج کشی کا سنہری موقع مل جائے۔ ایسے میں ایرانی تجاویز اگرچہ پاکستان سے کشمیر کے معاملہ میں کچھ کڑوی گولیاں نگلنے کی متقاضی ہیں مگر اس وقت کے آجانے تک جب حالات امت مسلمہ کے موافق ہو جائیں' پاکستان کی بقاء کے نام پر یہ سودا گھاٹے کا نہیں۔ خصوصی طور پر اس وقت جب کہ پاکستان کی باگ ڈور ایسے نادان' ضدی اور سیاسی نابالغوں کے ہاتھ آچکی ہے جو کھلونا نہ ملنے پر توڑ دینا پسند کرتے ہوں۔ OO

اقتدار احمد

ایک ٹیکنو کریٹ سیاستدان' ایک واقفِ حال شہری اور ایک قرآنی مفکر کا اتفاقِ رائے

ڈالروں کی مشرق و مغرب سے اُمڈتی یہ گھٹائیں : کتنی حقیقت' کتنا فسانہ !

ڈالر آ نہیں رہے' پاکستان کی دولت جائے گی---- جاتی رہے گی

اس صیہونی منصوبے پر عملدرآمد نیو ورلڈ آرڈر کی بنیادی ذمہ داری ہے

اس جمعہ (۱۴/اکتوبر) کو امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے مسجد دار السلام باغ جناح لاہور کے اپنے خصوصی خطاب میں پاکستان پر ڈالروں کی بارش کو موضوع گفتگو بنایا۔ ان کی اس یادگار تقریر کا پریس ریلیز تو آپ سرورق کی پشت پر دیکھ لیں گے لیکن ظاہر ہے کہ اخبارات کو جاری کئے جانے والے خلاصے میں پوری بحث کو سمو دینا ممکن نہیں ہوتا جبکہ یہ اختیار بھی نیوز ایڈیٹروں کو حاصل ہوتا ہے کہ اپنی صوابدید پر خبر کا جو حصہ چاہیں کاٹ کر نکال دیں اور اختصار کے لئے ان کی قطع و برید بعض صورتوں میں یہ قیامت ڈھاتی ہے کہ بات کا اصل مفہوم "غت ربود" ہو کر رہ جاتا ہے چنانچہ کوشش کی جا رہی ہے کہ ان صفحات میں محترم ڈاکٹر صاحب کے خطاب کے اصل نکات کا احاطہ اس طور پر کیا جائے کہ کم از کم ان کی روح تو مجروح نہ ہو۔

ڈاکٹر صاحب کی مفصل گفتگو کو آسانی سے پانچ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک' وہ معلومات جو ڈاکٹر مبشر حسن صاحب کے اخباری بیانات سے حاصل ہوئیں اور جن کی تفصیل اور تائید مزید کے لئے ان سطور کے راقم نے خود ان سے مکالمے کے لئے اصالتاً ان کے دولت خانے پر حاضری دی۔ دوسرا' فنی معلومات کا ایک ضمیمہ جو تنظیم اسلامی ہی کے ایک ٹیکنو کریٹ رفیق نے اپنے امیر کے حکم کی تعمیل میں فراہم کیا۔ تیسرا' جناب نعیم صدیقی کی ایک آزاد نظم کا ذکر اور اس کے منتخب حصوں سے سامعین کو درس عبرت دینا جس میں انہوں نے ڈالر کی وہ برکات ۴۳ برس پہلے محسوس کر لی تھیں جن کا خدشہ ڈاکٹر مبشر حسن صاحب نے آج ظاہر کیا ہے۔ چوتھا' مقرر کا اپنا ایک وجدانی خیال جس کی کوئی ٹھوس دلیل بقول خود ان کے پاس موجود نہیں لیکن قارئین دیکھ ہی لیں گے کہ بیان کے اس حصے کے بین السطور ان کے خیال کے لئے مضبوط دلائل تلاش کر لینا ہرگز مشکل نہیں' آخری اور پانچواں حصہ اس محکم فکر کے پس منظر میں مسئلہ زیر بحث کا تجزیہ ہے جس کی صلاحیت محترم ڈاکٹر صاحب نے قرآن مجید کے متن' قرآنی فلسفہ تاریخ اور واقعات و حالات کی رفتار کے مطالعے کو اپنے ذاتی مشاہدات اور غور و فکر سے مربوط کر کے حاصل کی ہے۔

پہلی چیز پہلے' ڈاکٹر مبشر حسن صاحب کی دانشورانہ دیانت' وطن سے محبت اور مایوس ہو کر بیٹھ رہنے کے بجائے اپنے نظریات کے مطابق کام کئے چلے جانے پر ڈاکٹر صاحب نے انہیں کھل کر خراج تحسین پیش کیا اور ان کی باتوں پر تکیہ کرنے کی وجوہ بھی بیان کیں۔ یہ کہ وہ ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھی' پیپلز پارٹی کے تاسیسی رکن اور پہلے سوشلسٹ وفاقی وزیر خزانہ ہیں اور اب بھی بے نظیر کے انکل تو ہیں لیکن نہ موجودہ پی پی میں شامل ہیں اور نہ اس کی حکومت سے کوئی علاقہ رکھتے ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ اپوزیشن اور نواز شریف سے بھی ان کا کوئی عملی یا نظریاتی تعلق نہیں کہ ان کا شمار بے نظیر حکومت کے مخالفین میں کیا جا سکے۔ یہ کہ وہ زیر بحث معاملات پر گہری نظر رکھتے ہیں کیونکہ انجینئرنگ کے متعلقہ شعبے میں انہوں نے ڈاکٹریٹ کی جسے ان کا عملی تجربہ اور وسیع مطالعہ زیادہ ہی معتبر بنا دیتا ہے۔ بالخصوص آبی وسائل سے حاصل ہونے والی برقی توانائی کے مسئلے پر وہ ہر دور میں اپنی ماہرانہ رائے کا کھل کر اظہار کرتے رہے ہیں اور یہ کہ خود ایک نظریہ کے حامل ہونے کی بنا پر ہی انہوں نے ضروری رہنمائی فراہم کر کے ہماری مدد کی ہے کیونکہ ہمیں بھی وہ ایک مثبت اگرچہ مختلف نظریہ زندگی پر یقین رکھنے اور اس کے لئے حسب استطاعت کام کرنے والوں میں شمار کرتے ہیں۔

ڈاکٹر مبشر صاحب نے کمال مہربانی سے متعلقہ موضوع پر اس وقائع نگار کی رہنمائی فرمائی اور اپنی سب باتوں کو اشاعت اور حوالے کے لئے کھلا چھوڑا۔ ان کی پوری فاضلانہ گفتگو کے لئے تو "ندائے خلافت" اپنی تنگ دامانی میں گنجائش نہیں پاتا' ایک خاصا ہی ٹھیک ٹھاک خلاصہ ہمارے رفیق کار نثار احمد ملک صاحب نے تیار کیا ہے جو ڈاکٹر صاحب سے اس ملاقات میں بھی موجود تھے۔ وہی ہم سب سے پہلے پیش کریں گے۔ انہوں نے ایٹمی توانائی کو بجلی کا ایک مہنگا اور خطرات سے پر (Hazardous) متبادل قرار دیا تھا جس پر ایک دوسری رائے بھی لینے کی ضرورت محسوس ہوئی اور تنظیم اسلامی کے ایک رفیق' ندیم اختر صاحب سے اپنے امیر کے حکم کی تعمیل میں فیکس کے ذریعے اس سلسلے میں بڑی اہم معلومات بہم پہنچائی ہیں جن سے Hazard کا مسئلہ تو حل نہیں ہوا البتہ خرچ میں کفایت کے پہلو پر بہت کام کی باتیں سامنے آئی ہیں۔ اضافی طور پر انہوں نے بجلی گھروں کو ایندھن پہنچانے اور بجلی کی ترسیل و تقسیم کے اہم تر مسائل کی طرف بھی توجہ دلائی ہے جس کو ہم نے ڈاکٹر مبشر حسن صاحب سے گفتگو میں نظرانداز کر دیا تھا۔

ڈاکٹر مبشر حسن صاحب نے فرمایا

آج بھی پہلے ہی کی طرح سرمایہ دارانہ نظام کی عملداری ہے اگرچہ اب اس کی نوعیت تبدیل ہو چکی ہے۔ اس سے یہ نظام سرمایہ داروں کی مرضی اور سہولت کے مطابق قائم کیا جاتا اور برقرار رکھا جاتا تھا۔

مثلاً انہیں ٹیکس میں سہولت دے دو' بجلی دے دو' گیس دے دو وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح ان کے لئے خام مال کی قیمت بھی مقرر کر دی جاتی تھی۔ گویا یہ سرمایہ دارانہ نظام حکومت وقت کے سایہ عاطفت میں پروان چڑھ رہا تھا لہٰذا کوئی سرمایہ دار فیل نہ ہوتا تھا۔ جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں اس طرح کے بڑے سے بڑے ادارے دیوالیہ بھی ہو جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں فوج نے بھی سرمایہ داروں کو تحفظ دیا۔ جہاں اس نظام کو دشواری محسوس ہوئی' فوج آ گئی۔ یہ سلسلہ ایوب سے ضیاء تک چلتا رہا۔

اب سرمایہ دارانہ نظام کی نئی شکل یہ سامنے آ رہی ہے کہ سرمایہ داری نظام کو حکومت سے آزاد کیا جا رہا ہے۔ اندرونی سرمایہ داروں اور بیرونی سرمایہ داروں کے درمیان معاہدے کرا دو' باہر اور اندر کے سرمایہ داری نظام کے درمیان جو دروازے حائل تھے وہ کھول دو۔ یہ ہے اب حکومت کی ذمہ داری۔ اسی طرح کسٹم ڈیوٹی کا تعین اور نفع لے جانے پر پابندی عائد نہ کرو۔ ان دونوں کو براہ راست سرمایہ داری کرنے دو! اس طرح گویا کہ معاملہ یہ ہوا کہ باہر کا سرمایہ دار جانے اور پاکستانی سرمایہ دار جانے! اب اندرونی و بیرونی سرمایہ کی Protection حکومت نہیں کرتی۔

اس وقت بادی النظر میں ہمیں جو یہ نظر آ رہا ہے کہ باہر سے دولت کا ایک سیلاب ہے جو امڈا آ رہا ہے' حقیقت میں یہ یہاں سے دولت کے انخلا کا سیلاب ہے۔ وہاں سے ہرگز کوئی ڈالر نہیں آئے گا۔ اس کی ابتدا ریگن کے دور سے ہوئی۔ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک نے شرائط عائد کیں کہ پرائیویٹائزیشن کرو' یعنی معاشی معاملات میں گورنمنٹ کا Role کم کر دو! اس طرح تیسری دنیا کی حکومتیں پرانی خامیوں کی وجہ سے ناکام ہوتی چلی گئیں۔ چنانچہ ضیاء صاحب کی حکومت معاشی معاملات میں بھٹو صاحب کی حکومت سے خاصی کمزور تھی۔ ہم نے پیپلز پارٹی کے پہلے ادوار میں Stand لیا تھا' اس لئے کہ ہماری کچھ نظریاتی مجبوریاں تھیں اور کچھ دوسرے اسباب بھی۔ ہم بیرونی پیسے کے بغیر بھی کام چلانے کے قابل تھے' اس لئے کہ اس وقت ہمارے تعلقات مسلم ممالک سے کافی اچھے تھے لیکن ہمارے برعکس ایوب خان اور یحییٰ خان کی حکومت امریکہ کے دست نگر رہی تھی۔ اگرچہ ایوب خان نے بعد میں یہ کہہ کر کہ "We want friends not masters" بظاہر اس کیفیت سے نکلنے کی کوشش کی تاہم یہ حالت دست نگری تیسری دنیا کی اس وقت کی تمام ہی حکومتوں پر طاری تھی۔ ان ممالک میں پاکستان' انڈیا' بنگلہ دیش' مصر' ملائشیا' تھائی لینڈ' سنگاپور شامل تھے۔ یہ سنگاپور ایک چھوٹا سا ان چینیوں کا شہر ہے جو ملائشیا سے نکلے اور یہاں انہوں نے نئی زندگی شروع کی۔ اسی طرح تائیوان ان لوگوں کی آبادی ہے جو چین سے ماؤزے تنگ کی وجہ سے بھاگنے والے تھے۔ یہ لوگ چینی گورنمنٹ کا ہزار ہا ٹن سونا ساتھ لے گئے تھے۔ ان دونوں چھوٹے چھوٹے ممالک میں جو لوگ تھے' وہ سب مہاجر بنے اور تاریخ سے یہ حقیقت ثابت ہے کہ جتنی محنت مہاجر کر سکتا ہے اتنی کوئی کر ہی نہیں سکتا۔ ہمارے ایشیائی بھائی حقیقی محنت امریکہ اور امارات وغیرہ میں جا کر کرتے ہیں اتنی اپنے ممالک میں نہیں کرتے۔

جنوبی کوریا کا معاملہ یہ ہے جسے ہم نے اپنے لئے ماڈل قرار دیا تھا کہ وہاں امریکہ قابض ہے کیونکہ وہاں اس نے زبردست جنگیں لڑی ہیں۔ اس ملک کا پرانا نظام ٹوٹ پھوٹ چکا ہے۔ امریکی جرنیل موجود ہیں' امریکی افواج موجود ہیں۔ اس فوج کی تنخواہ ضمانت یافتہ ہے۔ اب معاملہ ان تینوں یعنی سنگاپور' کوریا اور تائیوان کا یہ ہے کہ آزادی نہیں ہے' بولنے کی آزادی بھی نہیں ہے۔ وہاں پہ مزدور کا کوئی حق نہیں ہے۔ کام کرنے کے لئے دیہات سے عورتیں لائی جاتی ہیں اور انہیں چالیس پچاس کی تعداد میں ایک ایک کمرے میں رکھا جاتا ہے۔ خاندانی نظام ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا ہے۔ انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ اس طرح وہاں کے سرمایہ دار کے پاس دولت جمع ہوئی ہے۔

سوال کیا گیا کہ ڈاکٹر صاحب' آپ نے یہ نقشہ تو جنوبی کوریا کا کھینچا ہے جبکہ یہ ہونا شمالی کوریا کا چاہئے تھا جہاں سوشلزم کا راج ہے۔ اس پر ڈاکٹر مبشر حسن صاحب نے فرمایا کہ میں نے یہ نقشہ جنوبی کوریا کا ہی کھینچا ہے۔ چونکہ وہاں ڈکٹیٹر شپ ہے' کوئی جمہوری نظام نہیں ہے اور ڈکٹیٹر شپ میں ایسے ہی ہوتا ہے۔ جنوبی کوریا کے بارے میں یہ خیال کہ وہ کوئی ترقی یافتہ ملک ہے' ہرگز صحیح نہیں ہے۔ یہ بات بہت اہم ہے کہ کوئی ملک بھی دولت کی ریل پیل سے ترقی یافتہ اور ماڈل نہیں بن جاتا بلکہ ماڈل بنانے والی دوسری چیزیں ہیں جیسے بنیادی انسانی حقوق اور آزادی۔

جس نئے سرمایہ دارانہ نظام کی بات شروع میں کی گئی ہے' اس کی طرف تیسری دنیا کے ممالک کو مار پیٹ کر لایا جا رہا ہے۔ ہندوستان میں یہ نظام راجیو گاندھی کے دور سے آنا شروع ہوا کہ کمپیوٹر لایا جائے' کھلی مارکیٹ لائی جائے' ٹیکنالوجی لائی جائے گویا سوشلسٹ ماڈل ترک کر دیا جائے۔ اگرچہ وہاں ابھی پرائیوٹائزیشن اتنی نہیں چلی جتنی دوسرے ممالک میں چل رہی ہے۔

دراصل ہمارے لئے مسئلہ محض غیر ملکی سرمایہ دار کے داخل ہو جانے کا نہیں ہے بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ایک ہیبت ناک جانور "ملٹی نیشنلز" کے عنوان سے پیدا ہو گیا ہے۔ اس کی ہیبت ناکی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ ملٹی نیشنل کارپوریشنز مغربی ممالک کی حکومتوں پر بھی حاوی ہو چکی ہیں۔ یہ کارپوریشنز نہ صرف انڈسٹریل ہیں بلکہ فنانشل بھی ہیں چنانچہ سٹی بینک' بینک آف امریکہ' انگریزی بینک' جاپانی بینک' ان سب نے ایک دوسرے کے حصص خریدے ہوئے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ سٹی بینک ہمارے ہاں بھی کاریں قسطوں پر دے رہا ہے' مکان بنوا رہا ہے۔ آپ اندازہ لگائیں کہ سٹی بینک کو صرف چلانے کے لئے جو سالانہ بجٹ بنتا ہے وہ دنیا کے بہت سے ممالک کے بجٹ سے زیادہ ہوتا ہے۔ یہ محض چلانے کے لئے جو افرادی قوت اور سامان وغیرہ کا خرچہ ہے اس کا بجٹ ہوتا ہے۔ بینک کے پاس کیا کچھ ہے' اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔

یہ نظام جو ہمارے ہاں بھی آ رہا ہے' جو ڈسپلن لاگو کرنا چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ حکومت کسی شہری کو کچھ نہ دے۔ نہ مفت تعلیم دے' نہ مفت علاج کرے۔ اب تجویز یہ دی جا رہی ہے کہ نہریں بھی بیچ دی جائیں۔ اب معاملہ Efficiant Production کا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز تم پیدا کرو وہ دوسروں سے سستی اور مقابلے کی چیز ہو لیکن جس ملک میں بنیادی مفت تعلیم نہ ہو' اعلیٰ تعلیم کا ستیاناس ہو گیا ہو' ٹیکنالوجی نہ ہو وہ تو مقابلے کی چیز پیدا نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اس نئے نظام کو نافذ کرنے کی کوشش سے ہمارا مستقبل یہ ہے کہ بے روزگاری بڑھے گی' اس بے روزگاری کے نتیجے میں لاقانونیت بڑھے گی۔ تیسری طرف نوجوانوں کے لئے ترغیبوں کی کمی نہیں آنے دی جائے گی لیکن اس سے ایک طرف پیسہ چھینا جا رہا ہے دوسری طرف پچاس پچاس' ساٹھ ساٹھ لاکھ کی موٹر گاڑیاں دکھائی جا رہی ہیں۔ اسے سینما' وڈیو اور بے حیا قسم کی عیاشیوں میں الجھایا جا رہا ہے۔ ان

حالات میں کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ کلاشنکوف حاصل نہ کرے! اس کے حصول کے لئے وہ یقیناً دشمن کے پاس بھی جائے گا۔ ڈاکے ڈالنے کے لئے بینک جائے گا۔ یہ کلاشنکوف جب عام ہو جائے گی تو شیعہ سنی منافرت میں بھی استعمال ہو گی۔ گویا ہمارا مستقبل بےلاقانونیت ' بے روزگاری ' نفرتوں کا بڑھنا ' رواداری کا ختم ہوتے چلے جانا ' حکومت کا غائب ہو جانا اور Power اپنے ہاتھ میں ہونا ہے۔

ہمارے ہاں نفرتوں کا سیلاب ہر طرف سے امڈا چلا آ رہا ہے۔ ایک طرف تو فرقہ وارانہ نفرت کی فضا ' دوسری طرف علاقائی نفرتیں ' تیسری طرف لسانی عصبیتیں پہلے سے زیادہ طاقتور ہوتی جا رہی ہیں۔ اس نظام کے نتیجے میں انارکی کی ایک بھیانک تصویر ہے جو کھینچی جا رہی ہے۔ لیکن ان کا یہ نظام یہاں چلے گا نہیں۔ اس کے لئے موزوں حالات موجود نہیں ہیں۔

ڈالروں کی موجودہ اور مبینہ ریل پیل کی حقیقت دو لفظوں میں بیان کی جائے تو یہ ہے کہ نہ کوئی ڈالر آیا ہے نہ آئے گا۔ پہلے وہ معاہدے کہ جس میں کہا گیا ہے کہ چار بلین آئے گا ' حقیقت یہ ہے کہ آٹھ ' دس کمپنیوں نے واپڈا سے معاہدہ کیا ہے کہ ہم ۳۴۹۸ میگاواٹ بجلی پیدا کریں گے۔ اس پر ۳۵۰۵ ملین ڈالر خرچ ہوں گے۔ یہ بجلی واپڈا ساڑھے چھ سینٹ فی یونٹ کے حساب سے خریدے گا۔ اگر واپڈا یہ رقم نہ دے سکے تو حکومت پاکستان یہ رقم ادا کرے گی۔ اس کے علاوہ بہت سی رعایات دی گئی ہیں مثلاً چیزوں پر ڈیوٹی نہیں لی جائے گی وغیرہ وغیرہ ---- مثال کے طور پر ان میں سے دو معاہدوں کی تفصیل یہ ہے کہ معاہدہ جام شورو ۳۱۰ میگاواٹ بجلی پیدا کرنے کا ہے۔ اس پر ۴۱۷ ملین ڈالر خرچ ہو گا۔ یہ گیس سے چلے گا یعنی Combind cycle ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ گیس کے استعمال سے بجلی گھر لگایا جا سکتا ہے اور ۵۶۱۰۰۰ ڈالر فی میگاواٹ کے حساب سے لگایا جا سکتا ہے جو صحیح ریٹ ہے۔ اس لئے کہ آج کل تھرمل پاور پلانٹ ۵ سے ۶ لاکھ ڈالر لاگت سے فی میگاواٹ بجلی پیدا کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ کوئٹہ کا معاہدہ Com-bind gass سے چلنے والے پلانٹ کا معاہدہ ہے۔ اس میں ۱۰۴ میگاواٹ کی قیمت ۱۰۵ ملین ڈالر دکھائی گئی ہے یہ ایک ملین ڈالر فی میگاواٹ بنی۔ ایک تیسرے معاہدے میں سوا ملین ڈالر فی میگاواٹ ہے۔ ان ریٹوں کے فرق سے معلوم ہوا کہ جس نے جو چاہا ریٹ دے دیا۔

یہ جو کہا گیا ہے کہ ۳۵۰۴ ملین ڈالر خرچ ہوں گے تو دراصل رقم ۲۱۰۰ ملین ڈالر ہونی چاہئے۔ گویا اس قیمت میں ۱۴۰۰ ملین ڈالر کا گھپلا ہے۔ ان کا خرچ ۲۱۰۰ ملین ڈالر ہو گا۔ لیکن جو ۳۵۰۴ ڈالر دکھایا گیا ہے ' اس کے لئے انہیں صرف ۷۰۰ ملین ڈالر انویسٹمنٹ کرنی پڑے گی۔ ۲۸۰۰ ملین ڈالر بینک سے مل جائے گا۔ اس طرح ۱۴۰۰ ملین ڈالر اپنی جیب میں ڈال لیا۔ گویا ۷۰۰ ملین ڈالر پلانٹ لگنے سے پہلے ہی انہوں نے کما لیا جبکہ پاکستانیوں کی جیب سے ۳۵۰۰ ملین ڈالر جائیں گے۔ اگر صارف ادا نہ کر سکا تو حکومت ادا کرے گی۔ اس کے علاوہ ساڑھے چھ سینٹ فی یونٹ بجلی ان سے خرید کر ۷۰۰ ملین ڈالر سالانہ ان کو منافع ادا کریں گے یعنی وہ بجلی مہنگی خرید کر ' جو بجلی ہمیں اس سے آدھی قیمت پر خریدنی چاہئے۔ اس منافع کی کوئی وجہ سمجھ نہیں آتی۔ اس لئے کہ ان کی انوسٹمنٹ بینک کے قرضوں سمیت ۲۱۰۰ ملین ڈالر ہے۔ اس پر ۱۰ فی صد ہو تو ۲۱۰ ملین ڈالر منافع ہونا چاہئے ' اگر ۲۰ فی صد دیں تو ۴۲۰ ہونا چاہئے لیکن ۷۰۰ ملین کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ گویا ۳۰ سال تک اس منافع کی ادائیگی پاکستانیوں کو لوٹ کر کی جائے گی۔

ہانگ کانگ سے معاہدے میں بہت بڑا گھپلا ہے۔ یہ رقم جو (آٹھ بلین) ظاہر کی گئی ہے ' اصل میں ۸۰۰۰ ملین نہیں ہے بلکہ صرف ساڑھے پانچ بلین ہے۔ ۵۲۸۰ میگاواٹ پیدا کرنے کے لئے یہ پلانٹ جو کوئلے سے چلانا چاہتے ہیں ' پانچ لاکھ ڈالر فی میگاواٹ سے بھی کم میں لگا رہے ہیں۔ پاکستان نے اب تک دو لاکھ ڈالر فی میگاواٹ خرچ کر کے لگائے ہیں۔ خود واپڈا نے تھرمل پلانٹ لگائے ہیں۔ پانچ لاکھ فی میگاواٹ سے اس کی قیمت ۲۶۴۰ ملین بنتی ہے۔ گویا اس میں ۲٫۸۶ ارب ڈالر کی over pricing ہے۔ اب اس میں اصل سرمایہ کاری ۲٫۶۴ ارب ڈالر اور جب یہ چل پڑیں گے تو ۲۸ بلین یونٹ فی سال پیدا کریں گے۔ (یہ معاملہ صرف ہانگ کانگ والے دو صاحب کے ساتھ معاہدے کا ہے) اس لحاظ سے انہیں ۹۷۰ ملین ڈالر کا سالانہ منافع ہے ' ۲٫۶۴ کے اصل سرمایہ پر۔ اس طرح اس کی شرح منافع ۳۶٫۷ فیصد بنتی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حکومت پاکستان پاکستانی سرمایہ دار کو کیوں پاور پلانٹ کے لئے کوئی رعایت نہیں دیتی! حد یہ ہے کہ واپڈا کے بھی تھرمل پلانٹ لگانے کو Ban کر دیا ہے۔ یہ پابندی ہرگز جائز نہیں ہے جبکہ ان بیرونی معاہدوں کا پاک امریکہ تعلقات سے بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان معاہدوں میں کوئی ثقہ امریکی سرمایہ دار نہیں ہے بلکہ سب وہاں کے نادہندہ لوگ ہیں۔ یہ محض ہمارا معاشی اور معاشرتی استحصال کرنے کا بہانہ ہے۔ یہ حقیقت بعد میں معلوم ہو گی کہ بہت سے پلانٹ تو لگے ہی نہیں ہیں۔ یہ امریکی سرمایہ کار بینک سے قرضہ لے کر بھاگ جائیں گے۔ اس لئے کہ یہ سب مشتبہ قسم کے لوگ ہیں۔

ہمارے ملک کے حالات اس طرف جا رہے ہیں کہ یہاں سرمایہ کاری ممکن ہی نہیں۔ جب کارخانے لگانے والے اغوا ہونے لگیں ' ان سے جگا ٹیکس وصول کیا جا رہا ہو۔ غنڈہ گردی کا یہ عالم ہو کہ غنڈے مرضی کی لیبر لگانے پر کارخانہ دار کو مجبور کر دیں تو کون سرمایہ کاری کا خطرہ مول لے گا! آپ کا اپنا سرمایہ دار پیسہ لگانے کو تیار نہیں تو باہر والوں کے پیٹ میں کیوں مروڑ اٹھے گا۔ یہ تو موٹر وے کی طرح کا ہی ایک سکینڈل ہے۔ اگرچہ فرق یہ ہے کہ موٹروے میں ہم نے ایک چیز مہنگی خرید کی۔ بلکہ یہ ییلو کیب کی طرح بالکل ہی فراڈ ہے جس کے اثرات دور تک جائیں گے۔

ہانگ کانگ کے سرمایہ کار کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اس نے تو ابھی سندھ کے علاقے تھر سے کوئلہ نکالنا ہے۔ ایک پاور ہاؤس پر ایک سال لگے گا ' باقی کا کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ بنیں گے بھی یا نہیں۔ بن بھی جائیں تو یہ معاہدے ہماری مطلوبہ انرجی کا ایک چوتھائی بھی پیدا نہیں کریں گے۔ لیکن نیوکلیئر انرجی اس سے بھی زیادہ مہنگی ہے اور اس وقت اس میں خطرات بھی ہیں۔ جب تک ہمارے پاس پانی اور کوئلہ موجود ہے ' نیوکلیئر انرجی کا ہمیں سوچنا ہی نہیں چاہئے۔ اس طرح گیس سے بھی توانائی کی بہت سی ضروریات پوری کی جا سکتی ہیں۔ گیس کے ذخائر ختم نہیں ہونے والے۔ گزشتہ دس برسوں میں گیس کے حوالے سے بہت سی دریافتیں ہوئی ہیں اور اگر حکومت کہتی ہے کہ بلوچستان میں قبائلی فسادات کی وجہ سے زیادہ ذخائر دریافت نہیں ہو سکے تو اس کا مطلب یہ اعتراف ہے کہ ان کی کوئی حکومت ہی نہیں ہے جو ان جھگڑوں کو ختم کرے بلکہ یہ خود ان جھگڑوں کے سامنے بے بس ہے!

آپ ڈالروں کی برسات کی بات کرتے ہیں تو بہت سے ڈالر آئیں گے لیکن منشیات اور ہیروئن

کے ذریعے۔ اس سلسلے میں سینیٹروں اور ایم این اے صاحبان کو کھلی چھٹی پہلے بھی تھی، ممکن ہے کہ اب بھی ہو۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان معاہدوں کے ذریعے محض ڈالروں کا سماں باندھا گیا ہے، حقیقت کچھ بھی نہیں ہے اور آخر میں انہوں نے اس خیال سے بھی اختلاف نہیں کیا کہ یہ محض ایک ایکٹ کا ڈرامہ ہی ہو۔ عوام کو بہلانے کے لئے کوئی اور کھلونا ہاتھ آ جائے تو ممکن ہے کہ اس جھنجھنے کو توڑ کر پھینک دیا جائے اور کہا جائے کہ بغور دیکھنے کے بعد معلوم ہوا ہے کہ یہ منصوبے ملک و قوم کے دیرپا مفاد میں نہیں تھے

بجلی کے لئے جوہری توانائی کا استعمال

پاکستان میں اس وقت صرف ایک ایٹمی بجلی گھر ہے جس کی پیداواری گنجائش ۱۳۷ میگاواٹ ہے جو پاکستان میں بجلی کی کل پیداواری گنجائش کا ۱ء۲ فی صد ہے۔ اس بجلی گھر سے حاصل ہونے والی بجلی کی قیمت تھرمل بجلی کی نسبت بہت زیادہ ہے۔ ایک ایٹمی بجلی گھر کے منافع بخش ہونے کے لئے اس کی گنجائش کم از کم ۷۰۰ میگاواٹ ہونا ضروری ہے۔ اس سے زیادہ کی پیداواری گنجائش کے پلانٹ پر پیدا ہونے والی بجلی کی قیمت تھرمل بجلی سے کم ہوتی ہے۔ بڑے ایٹمی پلانٹ جن میں ایندھن کی افزودگی کا بھی انتظام ہو ان کو چلانے کی لاگت بہت کم ہو جاتی ہے اور اس طرح سستی بجلی پیدا ہوتی ہے۔ مستقبل میں ایٹمی توانائی کا استعمال بڑھتا جائے گا اور جن کے پاس ایٹمی صلاحیتیں نہیں ہوں گی، وہ توانائی کے میدان میں بہت پیچھے رہ جائیں گے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک منصوبے کے تحت ملک کی ایٹمی صلاحیت کو بڑھایا جائے۔ ایک یا دو پاور پلانٹ لے لینے سے یہ صلاحیت نہیں پیدا ہو گی بلکہ اس کی ٹیکنالوجی کو حاصل کرنے اور ترقی دینے کی ضرورت ہے جس میں کافی وقت درکار ہو گا۔ اس رائے کا اظہار بھی کیا جا رہا ہے کہ امریکہ بجلی کے لئے سرمایہ دے کر پاکستان کو ایٹمی صلاحیت سے محروم کرنا چاہتا ہے کیونکہ جوہری ٹیکنالوجی حاصل ہو جانے کی صورت میں اسے اپنے دوسرے مقاصد کے لئے استعمال کرنے کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔

یہ درست ہے کہ بجلی کی قلت ایک بہت بڑے اقتصادی اور سماجی بحران کا باعث بنی ہوئی ہے لیکن اس وقت جو سرمایہ کاری ہو رہی ہے اس سے کسی خیر کی امید نظر نہیں آتی۔ اخبارات بھی ان شکوک کا اظہار کرتے رہتے ہیں جو اس سلسلے میں پیدا ہو رہے ہیں اور اگرچہ ان شکوک کا اظہار کرنے والوں میں ڈاکٹر مبشر حسن جیسے قابل انجینئر، سابق وزیر خزانہ اور پی پی پی کے بانی رکن بھی شامل ہیں لیکن حکومت کی جانب سے کوئی تسلی بخش جواب سامنے نہیں آیا۔ عام طور پر جن شکوک کا اظہار ہو رہا ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

☆ ۔ ۱: بجلی کا نظام چار سطحوں پر مشتمل ہوتا ہے یعنی پیداوار، ترسیل، تقسیم، فروخت اور قیمت کی وصولی۔ ان چاروں کا نظام اپنی جگہ پر مستحکم ہونے پر ہی ایک اچھا نظام قائم ہو سکتا ہے۔ اس وقت پاکستان میں پیداوار یعنی جنریشن اور ترسیل یعنی ٹرانسمشن کا نظام نسبتاً بہتر ہے جبکہ ڈسٹری بیوشن یعنی تقسیم اور واجبات کی وصولی کا نظام بہت خراب ہے بلکہ بہت تیزی سے زوال پذیر بھی ہے۔ بجلی کی چوری انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔ بڑے بڑے نامی گرامی صاحب حیثیت لوگ بجلی کا بل ادا کرنے سے انکاری ہیں۔ کچھ لوگوں کے "علاقے" میں بجلی کا بل پیش کرنے کی بھی کسی کو "ہمت" نہیں ہوتی اور اگر کوئی چلا جائے تو زندہ واپس آنا مشکل ہوتا ہے۔ اس صورت حال میں صرف ایک پیداوار کو بڑھانے سے کام نہیں بنے گا۔ پورے نظام کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔ نہیں تو یہ نظام چھلنی کی مانند ہوتا جا رہا ہے جس میں سرمایہ ٹھہرے گا ہی نہیں اور عام آدمی کو کچھ حاصل نہ ہو گا۔

☆ ۔ ۲: نئے بجلی گھروں کو چلانے اور بجلی کی ترسیل کے لئے تیل کی پائپ لائن، ریلوے کے نظام، بندرگاہ کی توسیع اور بڑی ٹرانسمشن لائنوں پر مبنی ایک بالائی نظام یعنی انفراسٹرکچر کے توسیعی پروگرام کی ضرورت ہو گی جس پر اندازاً دس ارب ڈالر خرچ آئے گا۔ اس قسم کا سرمایہ اور منصوبہ فی الحال تو کہیں نظر نہیں آتا اور اس بالائی نظام کی غیر موجودگی میں یہ نئے بجلی گھر کیوں کر کام کر سکیں گے؟

☆ ۔ ۳: اس بات کا اعلان کیا گیا ہے کہ حکومت یعنی WAPDA ان پرائیویٹ تھرمل بجلی گھروں سے بجلی ساڑھے چھ سینٹ فی یونٹ کے بھاؤ پر خریدے گی جو اس وقت کے حساب سے ۱ء۹۸ روپے بنتے ہیں۔ غور کیا جائے کہ اگر خود واپڈا کو بجلی ۱ء۹۸ روپے کی پڑے گی تو صارفین کو کس حساب سے بیچی جائے گی۔ فی الحال واپڈا اور کراچی کی بجلی کمپنی کو آبی ذخائر سے پیدا ہونے والی یعنی ہائیڈل بجلی ۶ء۶۵ پیسے کی اور تھرمل بجلی گھروں سے ۲۷ء۹۳ پیسے کی ملتی ہے تب صارفین کو یہ بجلی اوسطاً ۲ روپے کے قریب فی یونٹ بیچی جاتی ہے اور تاحال ۴۳ فی صد بجلی ہائیڈل کی ہے!! مندرجہ بالا حقائق کی بنیاد پر یہ کہا جا رہا ہے کہ ان پرائیویٹ بجلی گھروں کے آنے کے بعد صارفین کو شروع میں ۳ روپے اور آخر کار ۶ روپے فی یونٹ کے حساب سے بجلی خریدنی پڑے گی۔

☆ ۔ ۴: اس طرف بھی توجہ دلائی جا رہی ہے کہ آج کل امریکہ کی مارکیٹ میں پرانے پاور پلانٹ کوڑیوں کے بھاؤ بک رہے ہیں اس کے علاوہ یہ بھی عین ممکن ہے کہ ہمیں نئے کی قیمت میں پرانے لیکن ری کنڈیشنڈ پلانٹ ملیں کیونکہ ہمارے ہاں نگرانی کا کوئی معقول انتظام تو ہے نہیں اور جو ہے وہ بدعنوان اور کمیشن خور ہے۔ غرض مندرجہ بالا قسم کے سوالات ایسے ہیں جن کا تسلی بخش جواب ابھی تک نہیں دیا گیا اور خطرہ اس بات کا ہے کہ دولت اور وسائل مزید تیزی سے نیو ورلڈ آرڈر کے رکھوالوں اور ان کے Agents کے ہاتھوں میں جا رہے ہیں۔ غلامی کی زنجیریں کستی جا رہی ہیں اور شاید ملک کو تقریباً بیچ دیا گیا ہے!!

☆ ۔ ۵: ۹/اکتوبر کے "ڈان" میں پہلے پرائیویٹ پاور پلانٹ "حب کو" کا پراسپکٹس چھپا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کمپنی کے معاہدوں پر پاکستان کا قانون لاگو نہیں ہوتا۔ اخبار لکھتا ہے کہ

"All majer agreements relating to the project are subject to English Law."

یعنی اس پروجیکٹ سے متعلق تمام بڑے معاہدات پر برطانوی قوانین کا اطلاق ہو گا۔ پھر ایک معاہدے کے بارے میں تحریر ہے کہ

"Agreement between K and M, Raytheon Ebasco and HUBCO are all subject to New York Law."

یعنی کے اینڈ ایم اور ریتھیون ایباسکو کمپنیوں اور حب کو کمپنی کے مابین تمام معاہدات نیویارک کے قوانین کے تحت ہیں۔

جناب نعیم صدیقی --- (معاف کیا جائے اس وقائع نگار کے دل میں یہ دانشور شاعر اس وقت سے

جناب نعیم صدیقی کے نام سے لکھتے آئے ہیں جب وہ خود نویں دسویں کا طالب علم تھا' مولانا نعیم صدیقی سے اس کی یاد اللہ نہیں) ---- کی آزاد نظم اپنی پوری آن بان اور روانی کے ساتھ انہی صفحات میں کہیں فٹ ہو گئی اور محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا وجدانی نکتہ یہ تھا کہ امریکہ بہادر نے ڈالروں کا یہ سیلاب پاکستان میں اگر واقعی داخل کیا ہے تو صرف ایک ہی راستے سے کیا اور اس کا مقصد ہمارے ایٹمی پروگرام کو پوری طرح "رول بیک" کروانا ہے۔ ان کے اس سوال کا کوئی فوری جواب ممکن نہیں کہ کیا ہماری صنعت و معیشت' ہماری زراعت' ہمارے دفاع' ذرائع مواصلات' برقی توانائی اور بنیادی و خصوصی تعلیم اور علاج معالجے میں برقی توانائی کے سوا کسی اور شعبے میں بیرونی سرمایہ کاری اور ڈالروں کی رم جھم ہماری ضرورت نہیں تھی؟۔ یہاں تو "دل ہمہ داغ داغ شد' پنبہ کجا کجا نہم" والی صورت حال ہے لیکن مغرب (امریکہ) اور مشرق (ہانگ کانگ) دونوں جانب سے بیک وقت صرف برقی توانائی کے روگ کا ہی مداوا کیوں آیا ہے' صرف اس لئے کہ ہمیں اپنی جوہری صلاحیت سے محروم کر دیا جائے۔ ذوالفقار علی بھٹو نے ہمارا ایٹمی پروگرام "اسلامی بم" بنانے کے اعلان کے ساتھ شروع کیا تھا اور آج تک (یا جب تک اسے "کیپ" نہیں کیا گیا) ساری پیش رفت اسی ہدف کی جانب تھی جو اللہ کرے کہ کامیاب بھی ہو چکی ہو اور آج ہم یہ اعلان کرنے کی حیثیت میں ہوں کہ ہاں' ہمارے پاس ایٹم بم موجود ہے' خبردار! جو کوئی کسی بھول میں رہے!۔ جوہری توانائی کا پرامن استعمال تو ایک اضافی فائدہ ہے اور "نافلة لك" ہے کہ بجلی پیدا کرنے کے کام بھی آئے گی' زراعت میں تحقیق و ارتقاء میں معاون بنے گی اور علاج معالجے کے جدید ترین طریقوں تک بھی اس کے ذریعے ہماری رسائی ممکن ہو گی تاہم دنیا کا منہ بند کرنے کو ہمارا عذر یہ رہا کہ ہم ایٹمی پروگرام کو ترک نہیں کریں گے کیونکہ ہمارے پیش نظر اس کا صرف پرامن استعمال ہے اور خاص طور پر برقی توانائی کے جس بحران میں ہم پھنس کر رہ گئے ہیں اس کا علاج تو یہی آب نشاط انگیز ہے (یورینیم کی افزودگی میں "بھاری پانی" تو استعمال ہوتا ہے نا۔) کیونکہ آبی وسائل یعنی اپنے واحد دریا سندھ پر ڈیم بنا کر ہائیڈل بجلی پیدا کر کے بھی ہماری روز افزوں ضروریات پوری نہ ہوں گی۔ یہ الگ بات ہے کہ کالا باغ ڈیم پر کام شروع نہ کر سکنا ہماری قومی نااہلی اور سیاسی افلاس پر الگ سے ایک المناک نوحہ ہے۔ اس معاملے میں (نعوذ باللہ) قادر مطلق ضیاء الحق کے ہاتھ بھی اس کے اپنے بغل بچے جنرل فضل حق نے باندھ دیئے اور جونیجو' بے نظیر و نواز شریف میں سے بھی کوئی اس بھاری پتھر کو اٹھا نہ سکا' اپنے سیاسی و گروہی مفادات کے تابع مہمل بن کر چوم کے ہی چھوڑتا چلا گیا۔

اب تھرمل پاور کی رو ہمارے پورے ملک کے جسم میں دوڑا کر "برقی جھٹکا" دینے کے بعد امریکہ جیسی واحد سپر پاور کی طرف سے یہ مطالبہ آئے کہ بس اب اچھے بچوں کی طرح اپنا ایٹمی پروگرام بالکل "رول بیک" کر دو' یہ خطرناک کھلونا تمہارے کھیلنے کے لئے موزوں نہیں تو کیا ہم اپنے مائی باپ یعنی انکل سام کی بات ٹال سکیں گے؟۔ ڈاکٹر صاحب کا ازعانی و وجدانی خیال یہ ہے کہ "خاموش سفارت کاری" کا جادو چل چکا ہے اور ڈالروں کی برسات اسی سحر کا حصہ ہے بشرطیکہ یہ بھی محض نظر بندی کا کمال ہی نہ ہو اور حکم حاکم کی تعمیل کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ جوہری صلاحیت سے تو خصی ہو چکے' تھرمل پاور بھی "خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا' جو سنا افسانہ تھا" ثابت ہوئی اور آسمانی بجلی کی طرح بس ایک جھلک دکھا کر غائب ہو چکی ہے یا فیوز ہی اڑ گیا ہے تو ہم کس کی ماں کو روئیں گے؟۔ تاہم یہ دھوکے کی ٹٹی ثابت نہ ہو تب بھی اپنا ایٹمی پروگرام دے کر بجلی لینا ہمیں ہرگز منظور نہیں۔ بجلی کی یہ چکا چوند مغرب کے تہذیب و تمدن ہی کو مبارک ہو۔ ہم ایمان و ایقان کی روشنی سے اپنے ملک کو منور کر لیں گے۔

اور محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا وہ تجزیہ جس کے عمود سے ان کو سننے اور پڑھنے والا ہر باشعور شخص عمومی شناسائی رکھتا ہے' بہت تفصیل طلب ہے جسے بکمال و تمام دہرانے میں ہمارے صفحات کی کمی پھر آڑے آ رہی ہے لہٰذا محض اشارات پر اکتفا کرنا ہو گا۔ ان کی آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے اور جسے وہ لب پہ بھی لے آتے ہیں' اسے خاک فلسطین و عرب کو سرمہ بنا کر قرآنی بصیرت سے کام لئے بغیر دیکھنا ممکن نہیں۔ اپنے فکری امام' علامہ اقبال کے مصرعہ "سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف" کی جگہ فلسطین و عرب رکھ کر --- (مصرعہ بحر سے بالکل خارج نہیں ہوتا' وزن سے زیادہ گرتا بھی نہیں۔ قافیے کی خیر ہے!۔ علامہ خود بھی کبھی کبھی انہیں تنہا بھی چھوڑ دیا کرتے تھے) --- وہ کہتے ہیں کہ جنت میں ملاقات ہو گی' ان شاء اللہ ۔ تو میں اقبال کو اس کا قائل کر لوں گا کہ ایمان و عرفان کا بڑا مرکز فلسطین تھا جہاں ہزاروں انبیاء و رسل پیوند خاک ہوئے یا پھر عرب وہ سرچشمہ ہے جہاں سے سیدنا ابراہیمؑ و اسماعیلؑ اور آخر میں محمد رسول اللہ ﷺ والذین معہ کا علم و حکمت ابد تک انسانی قلب و ذہن کو سیراب کرنے کے لئے میسر رہے گا--- پھر ظاہر ہے کہ مدینہ و نجف تو دونوں ہی عرب عاربہ کا حصہ ہیں - یہ جملہ معترضہ اشارات میں شامل کرنا ضروری ہو گیا کیونکہ ڈاکٹر صاحب نے اقبال کی آخری عمر میں لکھی ہوئی نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" کو ہی وہ شاہکار قرار دیا جو خود ہمارے فلسفی شاعر کی بھی زندگی بھر کے غور و فکر کا نچوڑ ہے اور جس کے آئینے میں ہی وہ خود (یعنی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب) بھی واقعات و حوادث کا عکس دیکھتے اور پوری طرح استفادہ کرتے ہیں۔

قصہ تخلیق آدم قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بیان ہوا اور ہر جگہ اس میں ابلیس کے کردار کا ذکر بھی ہے جس سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ شیطان نے انسان کو گمراہ کرنے کا جو مشن اپنے دعوے پر اصرار لیکن اللہ تعالیٰ کی اجازت سے اپنے ذمے لیا تھا' وہ اپنے آخری مرحلے میں داخل ہو چکا ہے اور پچھلی چند صدیوں میں معرکہ خیر و شر میں غیر معمولی گرمی پیدا ہو گئی جب یہودیوں کی صیہونی تحریک نے ایک نیا منصوبہ تیار کیا اور عجیب بات یہ ہے کہ اس شیطانی منصوبے کا پورا خاکہ ایک ڈالر کے نوٹ پر مطبوعہ آج بھی موجود ہے۔ ڈالر پر اہرام کی تصویر جس پر ایک (دجالی آنکھ) کے نیچے Novous Ordo Seclorem اور ۱۷۷۶ء کا سن درج ہے' ایک نئے لادینی نظام کے دور کا آغاز ہے جس کا اصل ہتھیار مالیات کی نیام میں مستور ہے اور صیہونی یہودیوں نے اس کے استعمال کے لئے WASP یعنی "وائٹ اینگلو سیکسن پروٹسٹنٹس" کو منتخب کیا۔ گویا یہودیوں کی نئی عالمی مالیاتی حکومت کے قیام کا آلہ کار WASP کو بنا تھا جن کی نمائندگی اولاً انگریزوں اور فرانسیسیوں نے کی اور اب امریکی کر رہے ہیں۔ ۱۷۷۶ء کو جو ڈالر کے نوٹ پر رومن اعداد میں مرقوم ہے' سادہ دل لوگ امریکی کی آزادی کا سال سمجھتے ہیں جب کہ در حقیقت یہ صیہونی منصوبے پر عمل درآمد کی شروعات کا سال ہے جو "پروٹوکولز آف دی ایلڈرز آف زائنزم" سے ہوتا ہوا' اعلان بالفور کا مرحلہ طے کر کے آخر کار اسرائیل کے قیام پر منتج

ڈالر! میرے اس دیس کو
ناپاک نہ کرنا...

نعیم صدیقی

جب سے سنا کہ ڈالروں کی برسات کے موسم کی آمد آمد ہے تب سے قلب و ذہن میں ایک نظم نے گنگنانا شروع کر دیا تھا۔ اس ادب پارے کی روانی اور زیر و بم بلکہ پورے مفہوم کو تو روح نے اپنے اندر جذب کیا تھا جو امانت کا حق بدن سے کہیں بڑھ کر ادا کرتی ہے' یادداشت کے ظرف میں کہاں اتنی گنجائش کہ ۴۳ برس قبل پڑھے ہوئے اس کے مضمون کو محفوظ رکھ سکتی۔ گزشتہ شمارے کے اداریئے میں اسی حوالے سے میں نے جناب (اب مولانا) نعیم صدیقی کی اس شاہکار آزاد نظم کا ذکر کیا تھا۔ اس وقت اتنی مہلت نہ تھی' بعد میں انہیں زحمت دی تو انہوں نے کرم فرمایا اور اس کی نقل یہ صراحت کر کے ارسال فرما دی کہ نظم ستمبر ۱۹۵۱ء میں لکھی گئی تھی اور یہ کہ چوتھے بند میں جو چین کا ذکر ہے اسے اب پرانی تاریخ کا ایک حوالہ سمجھا جائے۔ مولانا نعیم صدیقی نے ڈالر کے نزول و جلوس کے مناظر چشم تصور سے دیکھے اور جن الفاظ میں بیان کئے تھے' حرف بحرف پورے ہوئے اور "پیٹرو ڈالر" نے ان کی اپنی جولنکا ڈھائی اس کے کھنڈر سے تو حال میں وہ خود بھی برامد ہوئے ہیں۔ "اور کیا دیکھنے کو باقی ہے" آپ سے دل لگا کے دیکھ لیا"۔۔۔۔۔۔ مدیر

ڈالر! میرے اس دیس کو ناپاک نہ کرنا
تو ظلم کا حاصل!
تو سحرِ ملوکانہ کا ایک شعبدۂ خاص
سرمائے کی اولاد!
تو جیب تراشوں کے کمالات کا اک کھیل!
تو سود کا فرزند
افلاس کی رگ رگ سے تو نچڑا ہوا خوں ہے!

بیواؤں کی فریاد!
ہے کتنے یتیموں کی فغانِ خاموش
تو ضعف کی اک چیخ!
تو کتنے شبابوں کا ہے اک نوحۂ دل گیر
تو کتنی تمناؤں کی اک قبر سنہری
تاریخ کا اک اشک!
تو جنگ کی پُرہَول نفیروں کا تجسم

تو موت کی پریوں کا فسوں کار ترنم
تو برقِ جہاں سوز کا خونخوار تکلم
لاشوں سے کمائی ہوئی دولت!
تہذیب کو تو زخم لگانے کی ہے اجرت
اف! کتنی ہی اقوام کے نیلام کی قیمت
بچھو کا تراڈنک
سانپوں کا ترا زہر
انگاروں کا ہے سوز
ہے سونے کے لفظوں میں لکھی تلخ حقیقت
ڈالر میرے اس دیس کو ناپاک نہ کرنا!

○

اے سونے کے ڈالر
اس فاقہ و افلاس پہ تو رحم نہ فرما
بھوکے ہیں یہاں پیٹ
ننگے ہیں یہاں جسم
پھر روگ ہیں اور درد
جو چارہ گری کے نہیں شرمندۂ احساں
یہ ٹھیک! "چچا سام" کے اے راج دلارے
لیکن میری اس بات سے ناراض نہ ہونا
بھوکے ہیں اگر پیٹ تو ہم بھوکے ہی اچھے
ننگے ہیں اگر جسم تو ہم ننگے ہی اچھے
ڈالر میرے اس دیس کو ناپاک نہ کرنا!

○

تو آئے تو ڈالر

ہوا۔

یہودیوں کا بنیادی مسئلہ تو اسرائیل کے قیام سے پورا ہو گیا لیکن اصل مسئلہ "نووس آرڈو سیکلورم" یعنی نئے لادینی عالمی نظام کا قیام ہے جس کی ریڑھ کی ہڈی مالیات ہے۔ اب نیل سے لے کر فرات تک عظیم تر اسرائیل کا قیام بھی کٹر مذہبی یہودیوں کا ہدف تو ہے لیکن درحقیقت اس مغضوب علیہم قوم کی صیہونی تحریک اپنی حکومت کی توسیع کے کھکیڑ میں پڑنا ہی نہیں چاہتی۔ اس کے پیش نظر تو پورے کرۂ ارضی کو اپنی مالیاتی حکومت کے زیر نگین لانا ہے جس کے نتیجے میں دنیا بھر کے "گوئم" اور "جنٹائل" (جو یہودیوں کے سوا عیسائی ہوں' مسلمان ہوں' بدھ مت کے ماننے والے ہوں' ہندو ہوں یا اور کوئی اوہام پرست انسان ہوں) نسل پرست صیہونیت کے بندۂ بے دام بن جائیں گے یعنی دنیا میں جہاں کہیں ہوں' اپنے صیہونی آقاؤں کے لئے کام کریں گے اور معاوضے میں بس اتنا حاصل کریں گے کہ جسم کا جان سے رشتہ برقرار رکھ سکیں اور مسلسل خدمت بجا لاتے رہیں۔ امریکہ اس صیہونی منصوبے کا آلہ کار بنا رہا اور پچھلے چند برسوں میں تو کھل کر یہ کردار ادا کر رہا ہے۔

اس صیہونی منصوبے کے نمایاں اہداف یہ ہیں کہ (۱) WASP کی فوجی قوت کے ذریعے چین اور دوسری آزاد و نیم آزاد اقوام کو مغلوب کیا جائے تاکہ نئے عالمی مالیاتی نظام کو کسی جانب سے مزاحمت درپیش نہ ہو' (۲) پوری دنیا میں حکومتوں کا عمل دخل کم سے کم کر دیا جائے اور اصل قوت سرمایہ داروں اور بالخصوص "ملٹی نیشنلز" کے ہاتھوں میں چلی جائے جن کے ذریعے ایک ننگا سرمایہ دارانہ نظام انسانیت پر مسلط ہو اور صیہونی مقاصد کو پورا کرے' (۳) شرم و حیا اور عصمت و عفت کا خاتمہ اور بالخصوص عالم مشرق کے خاندانی نظام کو توڑ پھوڑ کر رکھ دینا تاکہ شرف انسانیت سے محروم ہو کر انسان واقعی حیوان یعنی

سو عیش تو ہوں گے
سکھ چین اڑیں گے
زرخیز ہیں گو کھیت
پر قحط آئیں گے
سنہ کٹتے تو بھریں گے
ہم فاقے کریں گے
جاے تو سلیں گے
تن کم ہی ڈھکیں گے
آمد تو گرے گی
اور بھاؤ چڑھیں گے
ڈالر میرے اس دیس کو ناپاک نہ کرنا!

○

اس دیس میں تو آئے تو اے سونے کے ڈالر
آئے گا ربوا بھی
چھائے گا زنا بھی
پھیلے گا جُوا بھی
اُڑ جائے گا ہر پھول سے پھر رنگِ حیا بھی
اخلاق پہ منڈلائے گی ہر گندی وبا بھی
تو آئے تو ڈالر!
یاں لائے گا اک اور ہی افتاد یقیناً
یاں پھیلے گا نظریۂ الحاد یقیناً
ہو جائیں گے ایمان تو برباد یقیناً
انساں کو بنا دے گا تو جلاد یقیناً
پس جائے گی یہ ملتِ آزاد یقیناً

عبرت کا بنا نقش تیرے فیض سے ہی چین
ترکی ہے تو مظلوم
برباد فلسطین!
ڈالر میرے اس دیس کو ناپاک نہ کرنا!

○

تو آئے تو پھر ہم میں حمیت نہ رہے گی
اس قوم میں' اس دیس میں غیرت نہ رہے گی
اشراف میں کچھ بوئے شرافت نہ رہے گی
رشتوں میں کہیں روحِ اخوت نہ رہے گی
ڈرتا ہوں میں اسلام کی عزت نہ رہے گی
تو آئے تو ڈالر!
تسلیم کی خُو آکے رہے گی
تقلید کی بُو آکے رہے گی
احساس کی آواز رُکے گی
افکار کی پرواز رُکے گی
تو آئے تو ڈالر!
کچھ اور عنایات بھی ساتھ آتی رہیں گی
کچھ خفیہ ہدایات بھی ساتھ آتی رہیں گی
مغرب کی روایات بھی ساتھ آتی رہیں گی
اغیار کی عادات بھی ساتھ آتی رہیں گی
ادبار کی آیات بھی ساتھ آتی رہیں گی
صد رنگ خرافات بھی ساتھ آتی رہیں گی
ڈالر میرے اس دیس کو ناپاک نہ کرنا!

○

یہ خاکِ مقدس
اک قوم کا گھر ہی تو نہیں
اسلام کا گھر ہے
یہ حق کے لئے وقف ہے مسجد کی طرح
اک تجربہ گاہ
مخصوص جو قرآں کے اصولوں کے لئے ہے
اللہ کے لئے اس کے رسولوں کے لئے ہے
کانٹوں کے لئے کب ہے؟ یہ پھولوں کے لئے ہے
اس دیس میں اب بزم نئی ایک سجے گی
اس دیس سے تہذیب نئی ایک اٹھے گی
یہ تجربہ گاہ ایک نیا دور جنے گی
انساں کو نئی روشنی اب یاں سے ملے گی
پھر مطلعِ خورشید
ہے شعلہ بداماں
رنگوں کے یہ گرداب
کرنوں کے یہ طوفاں
ہیں صبح کے ساماں!

○

یہ آدمِ خاکی کے لئے آخری امید
یہ جنتِ اخلاق کی تاسیس' یہ تمہید
مستقبلِ انسان کی تاریخ کی تسوید
یہ آخری امید!
ڈالر میرے اس دیس کو ناپاک نہ کرنا!

"گوئم" اور "جنٹائل" بن جائیں اور اللہ کے چہیتے بندوں یعنی یہودیوں کی بے چون و چرا اور بے دام خدمت میں زندگیاں گزارنے لگیں ---- یہ باتیں صیہونی اکابرین کے پروٹوکولز میں ہی درج نہیں' یہودیوں کی کتاب "تالمود" میں بھی وضاحت سے لکھی ہوئی ہیں جو تورات کی جگہ اب ان کی اصل مذہبی کتاب بلکہ فقہ بھی ہے۔

تازہ ترین صورتحال یہ ہے کہ "نووس آرڈو سیکلورم" کی تکمیل کی ذمہ داری امریکہ کے نیو ورلڈ آرڈر کے سپرد کردی گئی ہے۔ امریکہ بذات خود تو دنیا کی سب سے زیادہ مقروض حکومت ہے تاہم پوری دنیا کو قرضوں کے جال میں جکڑ کر بے بس کرنے کے لئے اس نے "ملٹی نیشنلز" کو کھلی چھوٹ دے دی ہے' ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف جیسے ادارے بنا دئے اور سینکڑوں ایسے ملٹی نیشنل مالیاتی اداروں کو کارگزاری دکھانے کا موقع دیا جو بڑی سے بڑی حکومت کو بھی نکیل ڈال سکتے ہیں۔ شیطان کے یہ سب چیلے مشرق وسطیٰ' پورے افریقہ اور عالم عرب کو تو اپنے پنجوں میں جکڑ چکے ہیں' کہیں کہیں چھوٹی موٹی مزاحمت کے آثار ہیں مثلاً لیبیا کا نیم پاگل قذافی اور سوڈان کی ابھرتی نظر آنے والی نظریاتی ریاست لیکن یہ زیادہ دیر مقابلے میں ٹھہر نہ سکے گی۔ چین لوہے کا چنا ثابت ہو رہا ہے جس کے لئے خصوصی انتظامات زیر غور ہیں' ایران بھی ایک حد تک مسئلہ بنا ہوا ہے جسے ٹھکانے لگانے کے لئے کئی تجاویز پر بیک وقت عمل ہو رہا ہے تاہم "جو کھٹکتا ہے دل شیطاں میں کانٹے کی طرح" وہ درحقیقت مملکت خداداد پاکستان ہے۔ مصور و مجوز پاکستان علامہ اقبال اور بانی و معمار پاکستان محمد علی جناح کے خوابوں کی تعبیر اور برعظیم پاک و ہند میں چار صدیوں کی احیائی سرگرمیوں کا نتیجہ جو ملک خداداد کی شکل میں عالم وجود میں آیا اور آج بھی دنیا کی واحد نظریاتی ریاست ہے' ایک بہت جاندار نظریہ زندگی رکھتا ہے۔ اسے ڈالروں کی زنجیروں میں جکڑے بغیر

صیہونی منصوبے کی ہمہ گیر تکمیل ممکن نہیں جس کے بعد ہی اسے اس کے اصل جوہر سے محروم کیا جاسکے گا چنانچہ ڈالروں کا سیلاب آرہا ہے اور اس کے جلو میں بے حیا مغربی تہذیب کا ریلہ بھی ہے اور ہمارے خاندانی نظام کو درہم برہم کردینے کی غرض سے خاندانی منصوبہ بندی کے پردے میں عریانی' فحاشی اور بے قید جنسی انارکی کا طوفان بھی ہے اور قاہرہ کانفرنس اسی ہدف کی جانب ایک ایسی پیش قدمی تھی جس کے لئے مسلمانوں کا تہذیبی مرکز' نام کی ایک مسلمان خاتون کی سربراہی میں قائم یو این کا ادارہ اور ایک نظریاتی ملک کی مسلمان خاتون وزیر اعظم کو استعمال کیا گیا۔

ملٹی نیشنلز کے ذریعے ہماری معیشت کو ڈالروں کی زنجیروں میں جکڑ کر اس حد تک بے بس کر دیا جائے گا کہ ہم اپنے ذرائع اور وسائل کو فراموش کر کے ڈالروں کی آمد کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھ رہیں' اپنے جاندار نظریہ زندگی کو عملاً دفن کردیں یا مسجد و مدرسہ میں محبوس کر دیں اور اسی بے خدا تہذیب کے رنگ میں رنگے جائیں جس میں ہر مرد بس ایک مرد اور ہر عورت محض ایک عورت بن کر رہ جاتی ہے' رشتوں کا تقدس ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ پراسیس یہاں شروع ہو چکا ہے اور نواز شریف ہو یا بے نظیر دونوں اسے جاری رکھیں گے چنانچہ نواز شریف نے اپنی "تحریک نجات" میں اب تک اسلام کا تو کیا' خدا کا بھی نام نہیں لیا۔ دوسری طرف مذہبی جماعتوں کو "خراب کر گئی شاہیں بچے کو صحبت زاغ" یعنی وہ کہیں کے بھی نہیں رہے اور اب تو عزت سادات بھی گئی۔ ان کی بے وزنی عبرت انگیز بنتی جا رہی ہے۔

اس تشویش ناک اور حد درجہ مخدوش صورت حال کا واحد علاج اپنے نظریہ حیات یعنی اسلام کو مضبوطی سے تھامنے اور اقبال و قائد اعظم کے بنائے ہوئے ملک میں نظام خلافت کا قیام ہے۔ وہ مذہبی گروہ جو انتخابی سیاست کی بھول بھلیوں میں داخل ہو کر گم ہو گئے یا عنقریب ہو جانے والے ہیں' اب بھی عقل کے ناخن لیں تو ایک جماعت کی شکل ہی اختیار کر لیں تاکہ اگر مروجہ جمہوری عمل سے کسی بھی درجے میں کوئی خیر برآمد ہو سکتا ہے تو اس کی بھی کوئی سبیل نکلے ورنہ اصل ضرورت تو یہ ہے کہ انقلابی جدوجہد پر بھروسہ کرنے والی دینی قوتیں ایک پلیٹ فارم پر جمع ہی ہو جائیں' کم سے کم ایک متحدہ محاذ ہی بنالیں اور اپنی قوت مجتمع کر کے صیہونی منصوبے اور نیو ورلڈ آرڈر کی مزاحمت میں بنیان مرصوص بن جائیں۔ اسی کی کوشش تنظیم اسلامی کر رہی ہے' جس نے اپنے آئندہ سالانہ اجتماع (۲۱ تا ۲۴ اکتوبر) میں اسلامی انقلابی گروپوں کو ایک پلیٹ فارم پر بلا کر "ڈائیلاگ" کا آغاز کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ OO

بقیہ: رفقاء تنظیم اسلامی سے

کروں گا کہ بیسویں صدی عیسوی میں اٹھنے والی تحریکوں میں تنظیم اسلامی واحد تحریک ہے کہ جس کے نہ صرف افکار قرآنی ہیں بلکہ اپنے رفقاء کو جس نے قرآن کو براہ راست سمجھنے سمجھانے پر لگایا ہے۔ دوسری تحریکیں کسی شخصیت کے لٹریچر کی بنیاد پر اٹھتی رہی ہیں۔ پھر ان تحریکوں میں اگر قرآن کے دروس کا رواج ہوا بھی ہے تو وہ ترجموں اور تفسیروں کے مطالعہ کے حوالے سے ہی ہوا۔ جبکہ تنظیم اسلامی کے رفقاء میں عربی زبان پڑھنے پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ حلقہ ہائے مطالعہ قرآن کا قیام اور رفقاء کے اندر قرآن کے سمجھنے سمجھانے کا شوق منفرد خصوصیت ہے۔ بہت سی جماعتیں جو کسی مسلک کی بنیاد پر قائم ہیں' ان کے ہاں تو سرے سے کوئی لٹریچر موجود ہی نہیں ہے جبکہ بعض دوسری جماعتوں میں کسی شخصیت کا تحریر کردہ لٹریچر تو موجود ہے لیکن قرآن کے افہام و تفہیم کی طرف توجہ نہ ہونے کے برابر ہے۔

رفقاء گرامی اب آخر میں' میں آپ سے دو باتیں عرض کرکے اپنی گزارش ختم کروں گا۔ پہلی بات یہ کہ اس فکری نکھار کے باوجود بھی اگر ہمارے اندر حرکت پیدا نہ ہو اور تن من دھن لگادینے کا جذبہ پیدا نہ ہو تو مجھے بتائیے اس سے بڑھ کر ناشکری کیا ہوگی۔ اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ آپ کو علمی طور پر تو ان سب باتوں کا شعور حاصل ہے لیکن اس امر کا شاید ادراک نہیں ہے کہ آپ کو اس عہد میں ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ اور تنظیم اسلامی کی شکل میں کتنی بڑی نعمت میسر آگئی ہے۔ اندھیروں کے سرپھرے نقیب کس قدر سبک رفتار ہیں' شاید آپ کو اس کا اندازہ نہیں ہے۔ اس کے برعکس اگر ہم روشنی کو چھپائے پھریں تو گویا ہمیں اس حقیقت کا ادراک ہی نہیں کہ آج روشنی عام کرنے کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ آپ کو اپنے بوڑھے امیر کی مشقت کا بھی اندازہ نہیں اگر ہم میں سے ہر کوئی اس بوڑھے شخص جتنی محنت شروع کردے تو منزل دور نہیں۔

رفقاء گرامی' ہمیں اس دنیا میں کامیابی کے لئے بھی اور اخروی فلاح کے لئے بھی محنت بہرحال کرنی پڑے گی۔ آج آپ ازسرنو جائزہ لیجئے کہ آپ تنظیم اسلامی میں کیوں شامل ہوئے تھے۔ کیا ان مقاصد کی طرف کوئی پیش رفت بھی ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ جماعتی سہارے کے ذریعے کسی خود فریبی میں مبتلا ہوں۔ اگر آپ تنظیم اسلامی میں محض جماعتی سہارے کے لئے ہیں تو ازسرنو غور کیجئے۔ آپ کی اور میری نجات محض اس وجہ سے نہیں ہوگی کہ ہم کسی جماعت میں شامل تھے۔ ہماری نجات جماعت کے اندر ہماری انفرادی محنت پر منحصر ہے۔ میرے ہمسفرو! یہ ایک حقیقت ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ مقاصد لاشعور کی تہوں میں دب جاتے ہیں جن کے لئے جماعتوں میں شمولیت اختیار کی جاتی ہے اور جماعت خود مقصد بن جاتی ہے۔ اس لئے گاہے گاہے ان مقاصد کا جائزہ لینے کے لئے "فکری مراقبہ" کرتے رہنا چاہئے۔

رفقاء گرامی! تنظیم اسلامی کے نظم بالا کی طرف سے یقیناً آپ کو بڑے بڑے اہداف سونپے جائیں گے۔ اس سالانہ اجتماع کے موقع پر میں ادارہ "ندائے خلافت" کی طرف سے آپ کی خدمت میں ایک چھوٹا سا ہدف پیش کرتا ہوں۔ آئندہ سال اگر آپ اس ہدف پر اپنی محنت صرف کریں تو نتائج بہت ہی حوصلہ افزا ہوں گے۔ میری طرف سے وہ ہدف یہ ہے کہ بیسویں سالانہ اجتماع کے موقع پر ہر شخص ایک نیا رفیق بنا کر اپنے ساتھ لائے۔ یہ بہت ہی چھوٹا سا ہدف ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر اس سال ہزار رفقاء سالانہ اجتماع پر آئے ہیں تو آئندہ سالانہ اجتماع پر دو ہزار ہوں گے' اس کے بعد چار ہزار اور اس کے بعد آٹھ ہزار! آٹھ ہزار رفقاء تنظیم اسلامی کے منظم ہو جانے کے معنی یہ ہوئے کہ آپ آئندہ چار سالوں کے دوران ملک کی سب سے بڑی اسلامی انقلابی جماعت بن جائیں گے۔

رفقائے محترم' آیئے اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کے لئے ہاتھ اٹھائیں کہ وہ ہمارے عزم و حوصلہ کو بلند رکھے اور اقامت دین کی جدوجہد میں استقامت نصیب فرمائے۔ آمین۔ OO

داعیٔ تحریکِ خلافت کے چار روزہ دورۂ کوئٹہ کی مختصر روداد

پاکستان نے ایٹم بم بنالیا ہے تو ڈنکے کی چوٹ پر اعلان کرے' ڈاکٹر اسرار احمد

== بینظیر بھٹو کو چاہیے کہ والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ایٹمی پروگرام کو پایہ تکمیل تک پہنچائے ==

امریکہ نہیں چاہتا ہے کہ کوئی اسلامی ملک طاقتور بنے وہ خود مختار کشمیر کی شکل میں ایک اور اسرائیل بنانا چاہتا ہے

انتخابات کے ذریعے نظام بدلا جاسکتا ہے نہ اسلامی نظام نافذ ہو سکتا ہے' اس کیلئے جہاد کرنا ہو گا

سیاسی محاذ آرائی اور فرقہ واریت کے خاتمے کیلئے اسلامی نظام کا نفاذ ضروری ہے' کوئٹہ پریس کلب میں صحافیوں سے خطاب

—— وقائع نگار ——

امیرِ تنظیم اسلامی و داعیٔ تحریکِ خلافت پاکستان ڈاکٹر اسرار احمد نے ۲ اکتوبر تا ۵ اکتوبر کوئٹہ کا دعوتی و تنظیمی دورہ کیا۔ آپ نے کوئٹہ میں چار بھرپور دن گزارے جن کی مختصر روداد یہ ہے کہ آپ نے ۲ اکتوبر کو انجمن خدام القرآن بلوچستان کے سالانہ اجتماع میں شرکت کی۔ اس اجلاس میں انجمن کی نئی مجلس عاملہ اور عہدیداروں کا انتخاب عمل میں آیا۔

۳ اکتوبر کو امیر محترم نے پریس کلب کوئٹہ میں پریس کانفرنس کی۔ اس موقع پر آپ نے صحافیوں کی بہت بڑی تعداد سے خطاب فرمایا اور ان کے سوالات کے جوابات دیئے۔ کوئٹہ کے اخبارات نے آپ کی پریس کانفرنس کو نمایاں شہ سرخیوں اور تصویری جھلکیوں کے ساتھ شائع کیا۔

چنانچہ روزنامہ جنگ نے اپنی کوئٹہ کی اشاعت' ۴ اکتوبر ۱۹۹۴ء میں پریس کانفرنس کو اس تین کالمی سرخی کے ساتھ کہ "نفاذ اسلام کے لئے پرامن ایجی ٹیشن کی راہ اختیار کرنی ہو گی" پہلے صفحہ پر نمایاں جگہ دی۔ اس کے علاوہ تین اور ذیلی سرخیاں بھی لگائیں۔ روزنامہ جنگ اپنے سٹاف رپورٹر کے حوالے سے لکھتا ہے کہ "تنظیم اسلامی پاکستان کے سربراہ اور ممتاز عالم دین ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا ہے کہ دینی و سیاسی جماعتوں نے الیکشن کا جو راستہ اختیار کیا ہے اس سے اسلام کا نفاذ نہیں ہو سکتا اور اس مقصد کے حصول کے لئے پرامن ایجی ٹیشن کی راہ اختیار کرنی ہو گی۔ پیر کو یہاں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے حکومت پر زور دیا کہ اگر پاکستان ایٹم بم بنا چکا ہے تو اس کا ڈنکے کی چوٹ پر اعلان کرے' حکومت کا جھوٹ ساری قوم کو جھوٹا کرنے کے مترادف ہو گا۔ انہوں نے خبردار کیا کہ اسرائیل کسی مسلم ملک کو طاقت ور اور مستحکم نہیں دیکھنا چاہتا اور دنیا کی واحد سپرپاور بن جانے والا امریکہ پاکستان کو چین کے خلاف اپنے ایجنٹ کا کردار سونپنا چاہتا ہے' جس پر مزاحمت کی صورت میں وہ کشمیر کو آزاد کرا کے ایک چھوٹا سا اسرائیل

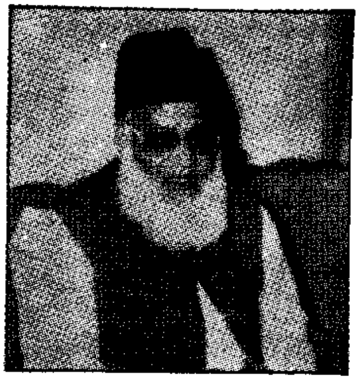

بنانے کا منصوبہ رکھتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ملک کے حالات بدتر ہوتے چلے جا رہے ہیں اور سیاسی محاذ آرائی جس رخ پر جا رہی ہے' اس کے نتیجے میں قومی سطح پر کوئی حادثہ بھی پیش آسکتا ہے۔ نوبت یہاں تک آ چکی ہے کہ عبادت گاہیں دہشت گردی کی زد میں ہیں۔ ایک لسانی گروپ کی طرف سے سندھ کی تقسیم کا مطالبہ پریشان کن ہے۔ فوج کی ساکھ اور اچھی شہرت کے خلاف کھل کر بات چیت ہو رہی ہے۔ عدلیہ میں پسندیدہ لوگوں کی تقرری کا شور ہے' کروڑوں روپے کے سیکنڈل یکے بعد دیگرے منظر عام پر آ رہے ہیں"-----

روز نامہ جنگ ڈاکٹر صاحب کے بیان کو جاری رکھتے ہوئے مزید لکھتا ہے کہ: ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ ریٹائرڈ ایئر مارشل نور خان کے مطابق بھارت میزائل ٹیکنالوجی میں ہم سے بہت آگے جا چکا ہے۔ اندرونی اور بیرونی حالات سیاست دانوں سے سنجیدگی کا تقاضا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ اگر پاکستان کے قیام کے بعد اسلامی نظام نافذ کر دیا جاتا تو ایک مستحکم اسلامی ریاست وجود میں آتی اور جن مسئلوں کا آج سامنا ہے وہ درپیش نہ ہوتے۔ وعدے کو پورا نہ کرنے کی اس کوتاہی کے نتیجے میں ایک خلاء پیدا ہو گیا ہے اور جب خلاء ہو تو طوفان آ جاتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ پوری قوم نفاق میں مبتلا کر دی گئی ہے اور ایک قوم بننے کی بجائے لوگ مختلف حوالوں سے تقسیم ہو چکے ہیں' لوگوں کو جوڑنے کا واحد ذریعہ اور راستہ اسلام ہے۔ انہوں نے افسوس کا اظہار کیا کہ دینی اور سیاسی جماعتیں کبھی اسلام کی خاطر یکجا نہیں ہوئیں اور کسی ایک کے خلاف جمع ہونے کی تاریخ بناتی رہی ہیں۔ لیکن ایوبی دور کے اسلام کے متصادم عائلی قوانین کو غیر اسلامی قرار دینے سے آگے بڑھ کر سیاسی معاملات کی طرح کا کوئی ایجی ٹیشن نہیں کیا گیا اور وہ قانون آج بھی نافذ چلے آ رہے ہیں۔ وفاقی شریعت کورٹ بھی اس سلسلے میں کچھ کرنے سے قاصر ہے۔ اس کے برعکس بھارت میں مسلمانوں نے اسلامی شریعت کے خلاف ایک عدالت کے مخالفانہ فیصلے کی پوری جرأت کے ساتھ مخالفت کی اور جانوں کی قربانی دے کر راجیو گاندھی کو مجبور کر دیا کہ بھارت میں مسلمانوں کے پرسنل لاء میں کوئی مداخلت کرنے کا اصول طے کر دے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ مذہبی جماعتوں نے انتخابات کی سیاست میں جا کر تجربہ کر لیا ہے اور سیکولر جماعتوں کے ساتھ ایجی ٹیشن کے نتائج

بھی سامنے ہیں۔ انہوں نے زور دیا کہ دینی جماعتیں اپنی قوت ضائع کرنے کی بجائے خالص مذہبی ایشوز پر محنت کریں۔ الیکشن میں پانچ جماعتیں اسلام کے نام پر ووٹ مانگیں تو ووٹ بہرحال تقسیم ہوں گے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ ملک میں اسلامی نظام کے نہ آنے کی وجہ اسلامی جماعتیں ہیں۔ انہیں اپنے اعلیٰ مقاصد کے لئے پرامن ایجی ٹیشن کی طرف آنا چاہئے۔ اگر بھارت میں بابری مسجد کو شہید کرنے کے لئے آر ایس ایس (انتہاپسند ہندو) کے ۳ لاکھ کارکن پرامن رہ کر اپنا ٹارگٹ حاصل کر سکتے ہیں اور وہاں مسلمان شیعہ سنی فسادات برپا ہوتے رہنے کے باوجود دین کی خاطر ایک ہو کر مزاحمت کر سکتے ہیں تو یہاں کے مسلمان اخلاص کا ایسا مظاہرہ کیوں نہیں کر سکتے۔ انہوں نے مزید کہا کہ بابری مسجد کے معاملے میں قتل و غارت مسلمانوں کے احتجاج پر پولیس فورس نے کیا تھا انہوں نے کہا کہ پاکستان میں ایک ایسی منظم جماعت کی ضرورت ہے کہ جس کا واضح راستہ متعین ہو اور کارکن حکم سے ادھر ادھر نہ ہوں۔ اس صورت میں اسلامی نظام قائم کیا جا سکتا ہے جو اگر قائم نہ کیا گیا تو بہت برا حشر ہو سکتا ہے۔ اس کے سوا صرف امریکہ کا تابع بن کر اور ایٹمی صلاحیت سمیت بہت کچھ ختم کرنا ہو گا۔ بزدل اسرائیل امریکہ کی پشت پناہی سے پاکستان کو بھی عراق بنا دینے کا خواہاں ہے۔ انہوں نے عالم اسلام کو خبردار کیا کہ یہودی دو سال کے اندر یروشلم کو خالص یہودی شہر بنانے کی پالیسی اختیار کئے ہوئے ہیں اور مسجد اقدس کو گرا کر یہودی معبد تعمیر کریں گے۔ انہوں نے کہا کہ احادیث کی روشنی میں اسلام کا پرچم مشرق سے ابھرے گا۔ انہوں نے کہا کہ مایوسی کی کوئی بات نہیں ہے اور ضرورت اس امر کی ہے کہ خدا کے حکم کے تحت استطاعت کے مطابق طاقت فراہم کی جائے۔ اپنے ایٹمی پروگرام سے پاکستان دستبردار نہ ہو یہ اس کا حق ہے اور اس پر کسی کی اجارہ داری تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ انہوں نے کہا

کہ بھٹو کی بیٹی جو آج حکمران ہے بھٹو مرحوم کی اس بات کو پورا کرنے کی راہ پر گامزن ہو کہ گھاس کھالیں گے لیکن ایٹم بم ضرور بنائیں گے۔ قادیانی مسئلہ جیسے نازک مسائل کو عوام کی مرضی کے مطابق طے کرنے والے ذوالفقار علی بھٹو کی بیٹی کو یہ تاریخی حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ ان کے والد مرحوم اور شاہ ایران یہی کہتے ہوئے اجل کو لبیک کہہ گئے کہ امریکہ ان کو مروانے کے درپے ہے۔ باہر کی امداد قابل اعتماد نہیں ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہ نہیں جانتے کہ پاکستان ایٹم بم بنا چکا ہے یا نہیں' حکومت کو سچ بولنا چاہئے اور اگر نہیں بنایا تو اعلان کرنا چاہئے کہ پاکستان ایٹم بم بنائے گا۔

اسی طرح منگل ۴ اکتوبر کے روزنامہ مشرق نے اپنے کوئٹہ ایڈیشن میں داعیٔ تحریکِ خلافت کی پریس کانفرنس کو تصویری جھلکیوں کے ساتھ پہلے صفحہ پر نمایاں انداز میں شائع کیا۔ روزنامہ مشرق نے دو کالمی سرخی لگائی کہ "تحریک چلائے بغیر نفاذ اسلام ممکن نہیں"۔ روزنامہ مشرق نے بھی جنگ کی طرح ڈاکٹر صاحب کی پریس کانفرنس کی تقریر کا بڑا حصہ شائع کیا۔

کوئٹہ سے شائع ہونے والے ایک دوسرے روزنامہ اخبار "زمانہ" نے ۴ اکتوبر کی اشاعت میں امیر محترم کی پریس کانفرنس کو تین کالمی پانچ جلی سرخیوں اور تصویر کے ساتھ پہلے صفحہ پر بہت نمایاں انداز میں جگہ دی۔ اس اخبار نے پہلی جلی سرخی یہ لگائی کہ "پاکستان نے ایٹم بم بنایا ہے تو ڈنکے کی چوٹ پر اعلان کرے" دوسری سرخی یہ تھی کہ "بے نظیر بھٹو کو چاہئے کہ والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ایٹمی پروگرام کو پایۂ تکمیل تک پہنچائے۔" اس اخبار نے اپنے متن میں اپنے سٹاف رپورٹر کے حوالہ سے لکھا کہ تنظیم اسلامی کے امیر ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا ہے کہ پاکستان نے ایٹم بم بنا لیا ہے تو اسے ڈنکے کی چوٹ پر اعلان کر دینا چاہئے اور اگر ہم نے ابھی تک ایٹم بم نہیں بنایا تو پھر ہمیں یہ کہنا چاہئے کہ ہم ایٹم بم بنا رہے ہیں.... موجودہ وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو کو چاہئے کہ وہ اپنے باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ایٹمی پروگرام کو پایہ تکمیل تک پہنچائیں۔"

اس اخبار نے امیر محترم کی پریس کانفرنس کی باقی کارروائی تھوڑے سے لفظی تغیر کے ساتھ بالکل روزنامہ جنگ اور روزنامہ مشرق کی طرح شائع کی ہے' لہٰذا باقی حصہ یہاں نقل نہیں کیا جارہا۔

کوئٹہ کے ایک اور مقامی روزنامے "تجارت" نے بھی ۴ اکتوبر کی اشاعت میں امیر محترم کی پریس کانفرنس کو جلی سرخیوں کے ساتھ شائع کیا۔ اس نے بھی یہ سرخی لگائی کہ "ایٹم بم ہے تو برملا اعلان کر دیا جائے"۔ روزنامہ تجارت کے مشمولات بھی مذکورہ بالا دوسرے اخبارات ہی کی طرح ہیں لہٰذا یہاں نقل نہیں کئے جا رہے۔ ان اخبارات کے علاوہ بھی بہت سے دوسرے انگریزی اور اردو اخبارات نے امیر محترم کے دورۂ کوئٹہ کے مختلف پروگراموں کو بھرپور کوریج دی۔

امیر محترم نے تین اور چار اکتوبر کو سائنس کالج آڈیٹوریم کوئٹہ میں خطباتِ خلافت ارشاد فرمائے۔ اس سے پہلے آپ ملک کے متعدد بڑے شہروں میں خطباتِ خلافت دے چکے ہیں' کوئٹہ کا قرض باقی تھا جو آپ نے چکا دیا۔ امیرِ محترم کے خطبات پر مشتمل اعلانات مختلف روزناموں میں دونوں روز شائع ہوتے رہے۔ روزنامہ جنگ نے اپنی چار اکتوبر کی اشاعت میں خبر کے علاوہ خطباتِ خلافت کے دوران میں لی گئی تصویر بھی شائع کی' جس میں داعیٔ تحریک کے علاوہ ناظم حلقہ سندھ و بلوچستان جناب سید نسیم الدین بھی نمایاں نظر آ رہے ہیں۔ اسی طرح روزنامہ "زمانہ" نے بھی خبر کے علاوہ تصویری جھلکیاں بھی شائع کیں۔

امیر محترم نے منگل ۴ اکتوبر کو دن گیارہ بجے ڈسٹرکٹ بار کونسل سے خطاب فرمایا۔ ۴ اکتوبر کے اخبارات میں ہی ڈاکٹر صاحب کے بار کونسل کے

(باقی صفحہ ۳۵ پر)

داعی تحریک خلافت پاکستان و امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد سائنس کالج آڈیٹوریم میں خلافت کے موضوع پر خطاب کر رہے ہیں (فوٹو: زمانہ)

کہ ہم نے انقلابِ چرخِ دوراں یوں بھی دیکھے ہیں

سردار اعوان

محمد بن عبدالوہابؒ سے بیعت کی بنیاد پر قائم ہونے والی اسلامی حکومت

اب وزیراعظم برطانیہ کا ہر مشورہ سر آنکھوں پر رکھتی ہے

برطانوی وزیراعظم' جان میجر کا پچھلے دنوں سعودی عرب کا سفر بہت ہی کامیاب رہا۔ نہ صرف سعودی عرب کو کئی بلین پونڈ کا سامان اور خدمات فراہم کرنے کا سودا ہوا بلکہ ان کا ہر مشورہ سعودی فرماں رواؤں نے سر آنکھوں پر لیا۔ شاہ فہد نے جان میجر کے اعزاز میں ایک شاندار ضیافت کا اہتمام فرمایا اور دونوں راہنماؤں نے ایران' یمن اور دوسرے علاقائی و بین الاقوامی مسائل پر تبادلہ خیال کیا۔ مگر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ شاہ نے بوسنیا کا مسئلہ بھی اٹھایا ہے یا کہ نہیں اور اگر اٹھایا ہے تو معزز مہمان نے کیا جواب دیا۔

تاہم جان میجر نے سعودی معیشت اور دونوں کے باہمی تجارتی تعلقات کو انتہائی خوش گوار اور خوش آئند قرار دیا۔ لیکن ادھر ریاض سے آگے وسطی صوبے' القسیم میں حالات زیادہ خوش آئند نظر نہیں آتے۔

گزشتہ کئی ہفتوں سے نجد کا یہ علاقہ خصوصاً صوبائی دارالحکومت "بریدہ" شاہی خاندان اور اسلامی تحریک کے مابین کشیدگی میں اضافے کا مرکز بنا ہوا ہے۔

اس معاملے میں پہل حکومت نے کی ہے۔ ۹/ ستمبر کو حفاظتی دستوں نے ڈاکٹر صفدر الحوالی کو "بہا" میں ان کے گھر سے اٹھا کر جیل میں بند کر دیا۔ "بہا" مکہ مکرمہ کے جنوب میں واقع ایک پہاڑی قصبہ ہے۔ اس سے قبل ڈاکٹر صفدر الحوالی کو' جو "ام القریٰ یونیورسٹی" مکہ مکرمہ میں شعبہ "عقیدہ" کے سربراہ تھے' ملازمت سے برخاست کر دیا گیا تھا۔ اب ان کی نظر بندی سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت نے اس تحریک کو کچلنے کا فیصلہ کر لیا ہے جو پہلی مرتبہ ۱۹۹۰ء میں اس وقت منظر عام پر آئی تھی جب امریکی افواج کو سعودی سرزمین پر اترنے کی اجازت دی گئی تھی۔

ڈاکٹر صفدر کے بعد اگلا نشانہ تحریک کے ایک ممتاز راہنما ۳۹ سالہ شیخ سلمان تھے' جنھوں نے خون ریزی سے بچنے کے لئے خود ہی اپنی گرفتاری پیش کر دی۔

کئی روز تک "القسیم" کا صوبہ خاص طور پر "بریدہ" میدان جنگ بنا رہا۔ پندرہ سو سے زائد اشخاص' جن میں طلباء' اساتذہ' علماء' سائنس دان اور دیگر ماہرین' شامل ہیں گرفتار کئے گئے۔ جبکہ اس تعداد میں آئے دن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ یہ کارروائی القسیم سے آگے ریاض' الجوف' جدہ' مکہ مکرمہ' طائف' ہیل اور مشرقی صوبے تک پھیلتی جا رہی ہے۔ گرفتار ہونے والوں میں شیخ عبداللہ الجلالی' شیخ ایاز القرنی' شیخ سلطان المنیس' شیخ ناصر' عمر العمر' اور شیخ بشر البشر جیسے مشہور علماء شامل ہیں۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ اس کا کیا نتیجہ برآمد ہو گا۔ حکومت کا دانش مندانہ اقدام تو یہ ہونا چاہئے کہ گزشتہ تین چار سال میں ملک کے سیاسی اور سماجی وقار میں جو زوال آیا ہے اس کی تلافی کے لئے دلی آمادگی سے کوشش کرتی۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ اس وقت جو حالات پیدا ہو چکے ہیں ان پر قابو پایا جا سکے تو معاشرے کو ایک بالکل نئی طرز پر ڈھالنے کا کام شروع کیا جائے۔ یعنی ایک اسلامی معاشرے کو سیکولر معاشرے میں بدلا جائے۔ یہ پالیسی معدودے چند ممالک میں کامیاب رہی ہے' جن میں پاکستان سب سے نمایاں ہے۔ دوسری اس طرح کی مثال ترکی ہے جہاں اسلام کو کامیابی کے ساتھ "مقید" کر دیا گیا تھا۔ لیکن ترکی ہی سے یہ بات بھی سامنے آ رہی ہے کہ وہاں کے عوام کو زیادہ عرصہ تک اسلام سے دور نہیں رکھا جا سکتا اور وہ جلد دوبارہ اسلام کی طرف لوٹنا شروع ہو جاتے ہیں۔

بیشتر سعودی محسوس کرتے ہیں کہ حکمران خاندان پہلے ہی درپردہ سیکولرزم کی راہ پر گامزن ہے لیکن ایک طرف حکمرانوں کی یہ پالیسی آشکارا ہو رہی ہے' وہیں دوسری طرف معاشرہ میں اس کے خلاف غم و غصے کی ایک بہت بڑی لہر ابھر کر سامنے آ رہی ہے۔ ایک آخری حربہ یہ ہو سکتا ہے کہ اس تحریک کو شروع میں ہی کچل دیا جائے۔ اس صورت میں مصر' تیونس اور الجزائر کے تجربات سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ یوں تو سعودی حکمرانوں کے لئے مراکش کی مثال سب سے زیادہ قابل رشک تھی کہ جہاں تمام تر خرابیوں کے باوجود شاہ حسن اپنی بادشاہت برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ لیکن سعودی حکمرانوں کو اس طرح کی "آزادی" میسر نہیں ہے۔

الجزائر میں فوجی ٹولہ گزشتہ تین سال کی غارت گری کے باوجود عوام پر قابو پانے میں ناکام ہو چکا ہے۔ اس کے بعد تیونس اور مصر کی مثال باقی رہ جاتی ہے۔ مصر میں حفاظتی دستوں کو عوامی قتل کا خاصا طویل تجربہ حاصل ہے اور تیونس کے ساتھ سعودی عرب حفاظتی کارروائیوں میں باہمی تعاون پر عمل بھی کر رہا ہے۔ لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ موجود ہے کہ مصر اور تیونس اپنے ہاں ساری غارت گری کے باوجود اسلامی تحریکوں سے چھٹکارا حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ وسائل اور ٹیکنالوجی کے اعتبار سے سعودی عرب کو مصر اور تیونس پر برتری حاصل ہو سکتی ہے مگر اس کے پاس غالباً سونگھ کر پتہ چلانے والی وہ قوت موجود نہیں ہے جو مصر اور تیونس کے پاس ہے۔ نو آبادیاتی نظام سے ورثے میں ملنے والی نوکر شاہی اور معاشرتی الٹ پھیر کے سبب وہاں لوگوں کو ڈنڈے یا لالچ سے قابو کر لینا نسبتاً آسان ہے۔ سعودی عرب کے پاس ایک تو اس طرح کے حربے اختیار کرنے کا وقت نہیں' دوسرے یہاں کا سماجی اور سیاسی ڈھانچہ ایک بالکل مختلف ماحول میں پروان چڑھا ہے۔

امارت سعودیہ کا ۱۹۳۲ء میں بادشاہت میں

تبدیل ہو جانا اس حقیقت کو نہیں بدل سکتا کہ اس مملکت کی بنیاد اس اتحاد پر قائم ہوئی تھی جو یہاں کے قبائل کے درمیان طے پایا تھا۔ اس سے جو حکومت وجود میں آئی تھی وہ اس بیعت کی بنیاد پر تھی کہ یہاں اسلام کی حکمرانی ہو گی۔ لہٰذا مصر اور تیونس کے برعکس جہاں عوام پر "پاشا" اور "بے" مسلط تھے، سعودی حکمران قبائلی سرداروں کے رحم و کرم پر تھے۔ یہاں کے قبائل اپنے آپ کو "رعایا" شمار نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے معاملات میں ہر لحاظ سے آزاد تھے۔ ان کے نزدیک "السعود" ان جیسا ایک قبیلہ تھا۔

تاریخی لحاظ سے سعودی حکومت شیخ محمد بن عبدالوہابؒ (۱۷۰۳ء - ۱۷۹۲ء) اور اس وقت کے "درعیہ" (Dariya) کے امیر، محمد ابن سعود (۱۷۴۲ء - ۱۸۰۳ء) کے درمیان مفاہمت کی مرہون منت ہے۔ ان دونوں کے درمیان یہ طے پایا تھا کہ وہ عرب کو فتح کر کے اس کی تطہیر کریں گے، جس کے بعد امیر اسلام کے مطابق حکومت کا نظام چلائیں گے۔ شیخ کی بیٹی سے امیر نے شادی کی اور شیخ سے یہ بیعت کی کہ وہ خود بھی اسلام پر عمل کریں گے۔ محمد ابن عبدالوہاب شیخ بھی تھے اور امام بھی۔ بعد میں ان کے بیٹے امیر، عبدالعزیز ابن محمد (۱۷۶۵ء - ۱۸۰۳ء) نے تجدید بیعت کی اور امام اور امیر نے ریاض کو فتح کرنے کا قصد کیا۔ بعد ازاں جب عبدالعزیز ابن عبدالرحمٰن السعود نے جزیرہ نماء کا بیشتر علاقہ فتح کر لیا تو مختلف قبائلی شیوخ نے انہیں شیخ الشیوخ کے طور پر تسلیم کر لیا۔ اس طرح السعود کی شیخ محمد ابن عبدالوہابؒ کے ہاتھ پر ہونے والی بیعت کی رو سے اسلامی طرز حکومت کے لئے سعودی ریاست قائم ہوئی جو تمام قبائل کے ایک وفاق کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کئی دوسرے سابق نو آبادیاتی ممالک کے برعکس، جہاں یہ بحث رہتی ہے کہ اسلامی طرز حکومت اختیار کیا جائے یا سیکولر، سعودی عرب میں کبھی اس طرح کی بحث کی نوبت نہیں آئی۔ گزشتہ دو عشروں میں سماجی اور انتظامی ڈھانچہ بڑی حد تک مغربی اثرات قبول کر چکا ہے مگر یہ دیکھ کر حیرت ہو گی کہ صرف اونچے طبقے اور معاشرے کے ایک چھوٹے سے حصے کے سوا سیکولرزم کہیں راہ نہیں پا سکا بلکہ معاشرے کا بیشتر حصہ ایک اسلامی تحریک کی شکل اختیار کر چکا ہے جسے اب نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔

سعودی حکمرانوں کو ہمیشہ اپنے جدید ترین دفاعی نظام اور عرب اور اسلامی دنیا کی قیادت پر گھمنڈ تھا، مگر صدام حسین نے جب کویت پر قبضہ کیا تو پہلے ہی ہلے میں سارا نشہ ہرن ہو گیا اور سعودی قیادت مغربی طاقتوں کے ہاتھوں میں کھیلنے پر مجبور ہو گئی، جس کے نتیجے میں غیر مسلموں کو اس مقدس سرزمین پر قدم جمانے کا موقعہ ہاتھ آ گیا۔ سعودی عوام ٹیلی وژن پر خیموں میں آباد عیسائی گرجا گھر اور آٹھ سو سالوں میں پہلی مرتبہ یہودیوں کو اس سرزمین پر "پیورم" (Purim) کا تہوار مناتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

اس صورت حال نے سعودی علماء اور اسلام پرست طبقے کو ہلا کر رکھ دیا۔ چنانچہ اپریل ۱۹۹۱ء میں ایک یاد داشت شیخ عبدالعزیز بن باز کے حوالے کی گئی تاکہ وہ اسے شاہ تک پہنچا دیں۔ اس پر چار سو سے زائد علماء، پروفیسوں، ججوں اور دانش وروں کے دستخط تھے۔ اس یادداشت میں، جو "خادم حرمین" کے نام تھی، والی الامر کی حیثیت سے ان سے ایک مکمل طور پر آزاد مشاورتی کونسل قائم کرنے اور موجود الوقت سیاسی، معاشی اور انتظامی شعبوں میں شریعت کے مطابق تبدیلیاں لانے کی درخواست کی گئی تھی اور ان شعبوں کی خصوصی طور نشاندہی بھی کر دی گئی تھی جو اصلاح طلب تھے۔ حکومت کو اس پر سخت صدمہ ہوا اور اس قسم کی یادداشت وصول کرنے پر شاہ نے شیخ عبدالعزیز بن باز سے ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا، مگر وہ اس دستاویز میں کوئی ایسی خامی تلاش نہ کر سکے جس پر بازپرس کی جا سکتی۔

جولائی ۱۹۹۲ء میں مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے ایک سو سے زائد ممتاز افراد کی جانب سے حسب سابق شیخ عبدالعزیز بن باز کے ذریعے ایک اور یادداشت شاہ کی خدمت میں پیش کی گئی، جو پہلی یادداشت کی نسبت زیادہ جراءت مندانہ اور تفصیلی جائزوں پر مبنی تھی۔ شاہ کی طرف سے اس اعلان کے چار ماہ بعد کہ جس مشاورتی کونسل کا مدت سے انتظار تھا وہ جلد وجود میں آنے والی ہے، اس یادداشت کا پیش کیا جانا مجوزہ مشاورتی کونسل پر عدم اعتماد کا اظہار تھا۔

اب ایسا دکھائی دیتا ہے کہ حکومت اسلام پرستوں اور مغرب زدگان کے مابین الجھ کر رہ گئی ہے، جس سے نکلنے کا اسے کوئی راستہ نہیں مل پا رہا۔ حکمرانی کا حق اسے اسلام کی بنیاد پر حاصل ہوتا ہے جبکہ اس کی سوچ یہ ہے کہ نیو ورلڈ آرڈر میں بقاء کا انحصار "آزاد خیالی" پر ہے۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ بینظیر بھٹو کا "مسلم سیکولرزم" یہاں کام نہیں دے سکتا۔ سعودی عرب میں چونکہ سیاسی پارٹی تشکیل دینا ممکن نہیں اس لئے اسلام پرست ایک جماعت کی صورت میں منظم نہیں ہو سکتے مگر اس کا ایک فائدہ بھی ہے کہ یہ تحریک، تحریک ہی رہے گی، کوئی طالع آزما سیاسی گروہ اسے ہائی جیک نہیں کر سکے گا۔ یہ تحریک ایک "نظریہ" اور کچھ افراد پر مشتمل ہے۔ افراد کو جیلوں میں ڈالا جا سکتا ہے، پھانسی دی جا سکتی ہے یا قتل کیا جا سکتا ہے مگر نظریہ کو نیست و نابود نہیں کیا جا سکتا۔ اپنے ایک آڈیو کیسٹ میں سلمان العودہ کہہ رہے تھے: "ہمیں جیل میں ڈالو چاہے قتل کرو، اپنے حالات تو درست کرو" شیخ عبدالعزیز بن باز نے ان کارروائیوں کو غیر ضروری قرار دیتے ہوئے تمام نظر بندوں کی رہائی کا مطالبہ کیا ہے۔ OO

بقیہ : اداریہ

نانہجاری کا حصہ سب سے زیادہ ہے، زمینی حقائق کی حد درجہ ناموافقت کے باوجود کچھ غیبی اشاروں کا یہ عندیہ کہ اسلام کا قلعہ بننا اس کا مقدر ہے اور سب سے بڑھ کر تین چار صدیوں کا وہ احیائی و تجدیدی کام جس نے کم از کم یہ تصور تو دلوں میں جاگزیں کر دیا کہ اسلام مذہب نہیں بلکہ ایک ہمہ گیر دین ہے۔ ان سب عوامل سے امید کی کرنیں چھن چھن کر آ رہی ہیں اور ان لوگوں کو کمر ہمت کسنے کا اشارہ کرتی ہیں جنہوں نے اللہ کے دین کے لئے اپنی توانائیاں وقف کرنے کا عہد کر رکھا ہے۔ عزم و ارادے میں پختگی ہو اور انسان اپنی زندگی میں ترجیحات کا تعین کرتے ہوئے شعوری طور پر یہ ملحوظ رکھے کہ اس عہد و پیمان کی کیا اہمیت ہے جو اس نے کسی کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر کیا ہے تو چھوٹے چھوٹے گروہوں نے بھی بڑے بڑے کام کر دکھائے ہیں۔ تنظیم اسلامی کے سالانہ اجتماع کے شرکاء کو ان الفاظ کے ذریعے ایک یاد دہانی مقصود تھی اور امید ہے کہ اس بے ربط تحریر نے یہ مقصد تو حاصل کر ہی لیا ہو گا کہ ہمارے ساتھی پڑے رہنے والوں میں شامل نہیں ہوں گے بلکہ وہ پیغام لے کر کھڑے ہو جائیں گے جو ان تک شرح و بسط کے ساتھ پہنچ چکا ہے۔ اس کام میں جسم و جان کی توانائیاں اور خون پسینے کی کمائی لگا کر وہ اسلام اور پاکستان کی خدمت کا دوہرا ثواب حاصل کر سکتے ہیں کہ پاکستان ہمارے خوابوں میں اسلام ہی کا گہوارا ہے اور اپنا سب کچھ لگا کر بھی ہم اپنے مشن میں ناکام ہوئے تب بھی آخرت کی کامیابی یعنی رضائے الٰہی کے حصول کی ضمانت تو ہے ہی ا۔ OO

ایڈیٹر کے ڈیسک سے

میں نے خود کو "چاند ماری" کے لئے پیش کر کے اجتماعیت کی ایک اہم ضرورت کی طرف توجہ دلائی

جی ہاں' یہ دل کا مَیل ہی تھا' نکل گیا تو اچھا ہوا نا!

اقتدار احمد

قارئین سے یہ رابطہ اب استوار رہنا چاہئے

"ندائے خلافت" کے شمارہ ۱۵/ اگست ۹۴ء میں میرے سلسلہ مضامین "زندگانی کی گزرگاہوں میں" کے تحت میری بپتا کے آخر میں ایک سوال شائع ہوا تھا۔ "اب میں لکھوں کہ نہ لکھوں؟"۔ اس کے جواب میں مجھے اپنی توقع سے کہیں بڑھ کر خطوط ملے جن کی دو سطری مجموعی رسید ۱۳/ ستمبر کے شمارے میں دے بھی چکا ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ خط لکھنے والوں کا مجھ پر اس سے بہت زیادہ حق ہے۔ میں نے تو موقع غنیمت جانا تھا کہ ہماری تحریک کی قیادت خاصے طویل عرصے کے لئے ملک سے باہر ہے چنانچہ قارئین کو زیادہ بے تکلفی کے ساتھ مخاطب کر سکتا ہوں۔

امیر جمع ہیں احباب دردِ دل کہہ لے
پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے

تاہم اس دشتِ خموشی کی پہنائی مجھ کو ڈراتی تھی کیونکہ جذبۂ پیدائی کو دل کی نا محکمی نے رہینِ پذیرائی بنا دیا تھا جس کے آثار اس وقت تک تو دُور و نزدیک نظر نہ آئے تھے۔ اب اپنی تحلیلِ نفسی کرتا ہوں تو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ حسنِ طلب کا ہی ایک انداز تھا۔ اللہ معاف کرے جو سینے میں پوشیدہ راز بھی جانتا ہے' میں نے اپنے قلم سے اب تک جو کام لیا خالصتاً لوجہ اللہ تھا لیکن محسوس ایسا ہونے لگا تھا کہ میری محنت بایں معنیٰ رائیگاں جا رہی ہے کہ تاثیر نہیں رکھتی یا بالکل ہی ناقابلِ توجہ ہے۔ یہ احساس اس تھوڑی بہت صلاحیت کو بھی زندہ درگور کئے دے رہا تھا جو مجھ سے کچھ نہ کچھ کام لیتی رہی ہے۔

یہ پرچہ اب ایک دینی تحریک کے خرچ پر چل رہا ہے' پہلے میرا ذاتی تھا تو اس کے صفحات کو جیسے چاہتا' استعمال کرتا اور شاید موصول ہونے والے ایک ایک خط کو شائع کر دینا مناسب و ضروری سمجھتا لیکن ظاہر ہے کہ بحالاتِ موجودہ اس کا کوئی جواز نہیں۔ اس پرچے کی ادارت میری طرف سے بلامعاوضہ خدمت ہے اور شاید اس اجتماعیت میں میرا حصہ بھی اسی قدر ہے جس کے فکر کی نمائندگی میرے ذاتی جریدے "ندا" نے کرنے کی ناکام کوشش اور اب "ندائے خلافت" نسبتاً بہتر طور پر کر رہا ہے۔

بایں ہمہ مجھ پر اپنے مہربان و قدر دان مکتوب نگاروں کا قرض واجب الادا تو ہے جس کی جزوی ادائیگی لکھنے کی اپنی کوشش جاری رکھ کر میں نے کر دی' دوسری قسط ان صفحات میں پیش کر رہا ہوں اور پھر بھی کچھ باقی ہے تو اس کے لئے کرم فرماؤں سے معافی کا خواستگار ہوں۔ اس دفعہ اضافی چار صفحات میں نے اپنے ذاتی خرچ پر شمارۂ زیرِ نظر میں شامل کئے ہیں کہ لگ بھگ اتنا ہی حجم اس میں میری "ذاتی تعریف توصیف" پر مشتمل ہے۔ ایک ضروری وضاحت یہ کہ جن قارئین کو اس تحریر میں اپنا ذکر نہ ملے' انہیں سمجھنا چاہئے کہ ان کا خط ڈاک کی نذر ہو گیا یعنی مجھ تک پہنچا ہی نہیں۔

اولین مرحلے میں موصول ہونے والے دو خطوط اس اعتبار سے بھی قابلِ ذکر ہیں کہ لکھنے والی محترم و ممتاز شخصیات کا کوئی عملی تعلق ہماری تحریک سے نہیں۔ ڈاکٹر انور سدید اردو ادب کے ایک مسلمہ نقاد اور پنجاب میں بالفعل موجود دو ادبی حلقوں میں سے ایک کے مشہور ترجمان ہیں اور جناب جمیل اطہر معروف صحافی ہیں جو اسی سال دولخت ہونے والی مدیرانِ جرائد کی قومی تنظیم "سی پی این ای" کے آخری متفقہ جنرل سیکرٹری تھے۔ ڈاکٹر انور سدید نے اپنے عنائت نامے میں فرمایا:

"ندائے خلافت کا ۱۵ اگست ۱۹۹۴ء کا شمارہ موصول ہوا تو میں نے معمول کے مطابق سب سے پہلے آپ کا "زندگی نامہ" یعنی ——— "زندگی کی گزرگاہوں میں" دیکھا اور اس کی لوح کے ساتھ یہ الفاظ پڑھ کر چونکا "اب میں لکھوں کہ نہ لکھوں"؟"۔ میں یہ عریضہ اس استدعا کے ساتھ پیش خدمت کر رہا ہوں:

"اقتدار صاحب' لکھئے اور ضرور لکھئے۔ یہ سلسلہ ہرگز بند نہیں ہونا چاہئے"۔

اس آپ بیتی میں متعدد ایسے واقعات آ چکے ہیں جو انسان کو حیرت زدہ کرتے ہیں' اسے سابق راستہ چھوڑ کر نیا جادۂ حیات اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں' بعض شخصیات کے چہرے جو پہلے دھندلے نظر آئے تھے' اب روشن دکھائی دیئے۔ بعض منور صورتیں آپ کے مشاہدات کی روشنی میں دھندلی ہو گئیں' ممتاز صحافی سید شبیر احمد اور اسلم کاشمیری "قومی ڈائجسٹ" میں اپنی سوانح حیات لکھ رہے تھے ان میں اتنا سچا مواد سامنے آ رہا تھا کہ میں انہیں داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اخبارات سے مرتب ہونی والی تاریخ جھوٹ بول سکتی ہے' سوانح عمریوں کے واقعات بالعموم شخصی شہادت سامنے لاتے ہیں اور زیادہ قابلِ اعتماد ہوتے ہیں۔ میں آپ کی زندگی کی گزرگاہوں میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں تو میرے پاؤں اس نم کو محسوس کرتے ہیں جو کبھی ان گزرگاہوں سے گزرتے وقت آپ نے محسوس کیا ہو گا۔ یہ تاثر میرے دل ہی میں نہیں دوسرے قارئین کے دل میں بھی پرورش پا رہا ہو گا۔ لہٰذا میری اس گزارش میں اپنے متعدد دوسرے قارئین کی درخواست بھی شامل سمجھئے۔ میں اس تاثر سے آپ کو پہلے آگاہ نہیں کر سکا تو یہ میری کوتاہی ہے جس کے لئے میں معذرت پیش کرتا ہوں"۔

ان کے خط کا دوسرا اور زیادہ بڑا حصہ خوفِ طوالت کے علاوہ اس ڈر سے بھی حذف کر رہا ہوں کہ ادبی دھڑوں کے اختلافات کے کانٹوں میں بے قصور گھسیٹا جاؤں گا۔ تاہم ان کی حوصلہ افزائی کا شکریہ کس منہ سے ادا کروں!۔

جناب جمیل اطہر نے لکھا:

"ندا اور اس کے بعد ندائے خلافت کا نہایت اہتمام سے مطالعہ کرتا ہوں اگرچہ بعض اوقات کسی پرچہ کے مجھ تک نہ پہنچنے کا احتمال رہتا ہے۔ "زندگانی کی گذرگاہوں میں" کے عنوان سے شائع ہونے والا سلسلۂ مضامین بلاشبہ

"ندا" کی ایک منفرد خصوصیت ہے اور اس سلسلہ مضامین میں قاری کے لئے دلچسپی کا مواد موجود ہے۔ میں یہ سلسلہ مضامین نہایت اشتیاق سے پڑھتا ہوں اور اس سے جہاں زندگی کے میدان میں آپ کی انتھک محنت اور جدوجہد کی تصویر سامنے آتی ہے وہاں معاشرتی مسائل اور معاملات پہ آپ کا گہرا مشاہدہ رہبری اور رہنمائی کا باعث بنتا ہے۔ براہ کرم "زندگانی کی گزرگاہوں میں" کا سلسلہ جاری رکھئے۔ حقیقت یہ ہے کہ ضخامت کم ہونے کے باوجود ندا میں چھپنے والی ایک ایک سطر مقصدیت کی آئینہ دار ہے۔ کہیں کہیں اختلاف کے پہلو بھی ہیں لیکن مجموعی طور پر ندا ایک نظریاتی پرچہ کی تمام ضرورتیں پوری کرتا ہے۔"

محترم! میں نے "رہبری اور رہنمائی" کا تو کبھی سوچا بھی نہیں۔ ہاں' زندگی کے بارے میں ایک نقطۂ نظر ضرور رکھتا ہوں اور اسی کے شعور کی جھلک میری تحریروں میں اگر پائی جاتی ہے تو "اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں"۔

اسی حلقے سے ہفت روزہ "تکبیر" کراچی کے ادارتی معاون فاروق عادل صاحب کا مکتوب بھی پورا نقل کیا جا سکتا ہے کہ مختصر ہے۔ "دوسرا عریضہ تو بیچارے شکایت کی نذر ہو گیا (جو ہمارے ایک گزشتہ شمارے میں شائع بھی ہو گیا تھا۔ ایڈیٹر) اس میں اس سوال کے جواب کا محل نہیں تھا کہ "اب میں لکھوں کہ نہ لکھوں"۔ گزارش ہے کہ لکھئے' ضرور لکھئے۔ آپ بیتی سے زیادہ خوبصورت چیز انسانی ادب میں اور کیا ہو گی؟۔ وہ دفتر جو آپ نے لکھ کر چھپا رکھے ہیں انہیں بھی چھاپ دیجئے اور اپنی سیاحت کی تمام روداد یں بھی۔ یہ تو ایک خدمت ہو گی"۔ اور جنگ پبلشرز میں اب ایک انتظامی عہدے پر فائز سید انیس نے اپنے صحافتی و ادبی پس منظر کی تفصیل بیان کرنے کے بعد لکھا کہ "آپ کے سفرناموں اور آپ بیتی کے حوالے سے عرض ہے کہ جن دنوں آپ کا سفرنامہ ترکی چھپ رہا تھا' مجھے ندائے خلافت کا خاص طور پر انتظار رہتا تھا۔ رسالہ ہاتھ میں آنے کے بعد میرا پہلا انتخاب آپ کا سفرنامہ ہوتا تھا۔ اپنی رائے میں بغیر کوئی لگی لپٹی رکھے یہ دوں گا کہ آپ کی تحریریں (خصوصاً سفرنامے' آپ بیتی وغیرہ) نہایت سہل انداز میں ثقیل بات دوسرے کے ذہن میں اتارنے کا ایک موثر ذریعہ ہیں۔ میرا یہ پرزور مطالبہ ہے کہ انہیں نہ صرف جاری رکھا جائے بلکہ کسی بھی صورت ان کا ناغہ نہ کیا جائے۔"

گوجرانوالہ سے ندیم کاشف صاحب نے اپنے طویل انگریزی خط میں "زندگانی کی گزرگاہوں میں" جیسی میری تحریروں کی قدر افزائی کرتے ہوئے ایک خوبصورت بات کہی ہے۔ (ترجمہ)۔ "آپ کی تحریروں سے مجھے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے حصول کی محنت میں اور معاملاتِ دنیا کی کدوکاوش میں بھی تقویت حاصل ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں ان میں پایا جانے والا آسان ادبی اسلوب کچھ اس طرح کا ہے اور الفاظ و خیالات لکھنے والے کے ذہن سے یوں کونپلوں کی طرح فطری انداز میں پھوٹتے محسوس ہوتے ہیں جیسے کوئی درخت برگ و بار لا رہا ہو"۔ ندیم کاشف صاحب نے فوٹو گرافی کے بارے میں اجتہاد کی میری خواہش پر سخت ڈانٹ پلاتے ہوئے "مسلم" کی یہ حدیث لکھی ہے کہ "اللہ تعالیٰ کے ہاں شدید ترین عذاب تصویریں بنانے والوں پر نازل ہو گا"۔ (او کما قال رسول ﷺ)۔ میں ان کے خیالات سے سو فی صد متفق ہوں' اس معاملے میں بس اتنی توجہ پھر دلاؤں گا کہ "تصویر" اور "فوٹو" میں بہت نمایاں فرق ہے جسے نظرانداز کیا جائے تو بڑی پیچیدگی پیدا ہوتی ہے۔

جامعہ پنجاب میں ایم اے کے ایک ہونہار طالب علم' عزیزم حافظ طارق محمود نے معترض حضرات کو ملاحیاں سنانے (جس کا باعث بننے پر مجھے اللہ معاف کرے) اور اپنے سمیت ان سب قارئین کے "سنگین جرم" پر سزائے موت (اور وہ بھی گلا گھونٹ کر) تجویز کرنے کے بعد جنہوں نے کبھی مجھے شکریہ اور تحسین کے چند لفظ تک نہ لکھے' تلافیٔ مافات کے لئے بحرِ طویل میں ایک قصیدۂ مدحیہ قلم بند کیا ہے۔ ان کا کوئی بھی جملہ دہراتے ہوئے حیا آتی ہے۔ میں اس تعریف و توصیف کا مستحق کبھی تھا نہ اب ہوں۔ لاہور ہی سے تجمل واحد صاحب نے کرم فرماتے ہوئے لکھا کہ "سوئے ادب نہ ہو تو ایک اور تشبیہ استعمال کروں گا۔ جیسے اقبالؔ نے کہا تھا کہ الٰہ آباد میں اکبرؔ اور آموں کے سوا رکھا ہی کیا ہے ویسے ہی عرض کرتا ہوں کہ حدیث امروز' افتتاحیہ اور "زندگانی کی گزرگاہوں میں" کے سوا ندائے خلافت میں اور ہوتا ہی کیا ہے' یہی توکّل متاعِ فقیر ہے۔ اگر آئندہ آپ کی تحریر پڑھنے کو ملنے کی شرط قارئین کے خطوط ہی ٹھہری تو میری اہلیہ کا کہنا ہے کہ وہ سَو بار خط لکھیں گی"۔

علومِ اسلامیہ میں ایم اے اور فاضل درسِ نظامی' مولوی سید محمد اجمل شاہ نے ژوب (بلوچستان) سے لکھتے ہوئے پرانے "ندا" کا ذکر بڑی حسرت سے کیا اور اس کے دوبارہ اجراء کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ ان کے نزدیک "ندائے خلافت" میں بھی "اگر آپ نہ لکھیں تو کون لکھے گا؟ اور یہ صرف میرے خیالات نہیں بلکہ ہزاروں قارئین کی دلی صدا ہے جو تحریر میں نہ لائیں تب بھی احساسات ان کے بھی یہی ہیں"۔ مالاکنڈ ایجنسی سے احسان الودود صاحب نے ان سادہ الفاظ میں دل کی بات کو زبان دی ہے کہ "کل پرچہ ملا اور سب سے پہلے آپ کا مضمون پڑھا۔ مضمون کیا تھا دل کو ہلا دینے والا اور افسوس و غم کا انبار تھا۔ آپ بھی تو ڈاکٹر اسرار احمد کے بھائی ہیں' سچی سچی بات لکھ دی ----- آخر میں مضمون کے جب آپ نے قارئین کی رائے پوچھی کہ لکھوں کہ یا نہ لکھوں تو ڈھارس بندھی کہ انشاء اللہ یہ سلسلہ جاری رہے گا"۔ انہوں نے بقول خود "تھوڑا پڑھا لکھا پٹھان" ہونے کے باوجود اپنے اس اصرار کے حق میں بڑی زوردار دلیلیں دی ہیں کہ مجھے لکھنے کا سلسلہ موقوف نہیں کرنا چاہئے اور اردو بھی ان کی اتنی اچھی ہے کہ ذرا بھی مشق کریں تو یہی خدمت وہ خود بھی انجام دے سکتے ہیں جس کی مجھ سے توقع فرمائی۔

پشاور صدر سے سید اصغر علی نے میری ہمت بندھانے کو بہت سی باتیں لکھنے کے بعد کیا خوب فرمایا ہے "مزید کیا لکھوں یہی کہ دل و دماغ میں اُمڈ آئے جذبات کو الفاظ میں پرو دینے کا مذاق گویا کہ مشکل ترین کاموں میں سے ایک ہے لہٰذا جو کچھ بھی بن پایا لکھ ڈالا۔ چھوٹا منہ بڑی بات کہ مجھ جیسا آپ سے کہے "لکھو' لکھو" لہٰذا آپ خود ہی لکھنا شروع کر دیجئے۔ شکریہ!"۔ بنی یاس' ابوظہبی (متحدہ عرب امارات) سے سید آصف علی رضوی نے اس بات پر بڑے دکھ کا اظہار کیا ہے کہ میری تحریروں کے قدردان ہونے اور متعدد بار یہ ارادہ کر لینے کے باوجود کہ ذاتی خط کے ذریعے ان کی افادیت پر اپنی رائے دیں گے' لکھ نہ سکے۔ "میں خط لکھنے کا چور اور کاہل ہوں"۔ تیمر گرہ ضلع دیر سے نصراللہ جان صاحب نے لکھا ہے کہ "سچ تو یہ ہے مجھے تو جیسے ہی "ندائے خلافت" کا شمارہ ہاتھ لگتا ہے سب سے پہلے آپ کے مضمون کا مطالعہ شروع کرتا ہوں"۔ ان کی فرمائش ظاہر ہے کہ یہی ہے کہ بدستور لکھتا رہوں۔ بنگیال ضلع جہلم سے ماسٹر محمد عدالت صاحب نے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے اس مشن کے مبنی برحق اور پُرخلوص ہونے کی گواہی دیتے ہوئے جس کی خدمت "ندائے خلافت" کر رہا ہے' اجازت مرحمت فرمائی ہے کہ "آپ ضرور لکھئے' لکھئے' ضرور لکھئے"۔

لاہور سے ہمارے محترم قلمی معاون سردار

اعوان صاحب کا منفرد انداز یہ ہے کہ "آپ کے ارشاد کی تعمیل میں مجھے یہ بتانا ہے کہ آپ یہ کالم "لکھیں یا نہ لکھیں" مگر مجھے یہ سوال پریشان کر رہا ہے کہ یہ سوال پیدا ہی کیوں ہوا یعنی آخر آپ کیوں نہ لکھیں؟ ...... آپ کی طبیعت بہت حساس لگتی ہے ورنہ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی بھی شخص بقائمی ہوش و حواس کہے گا کہ آپ اپنی تشہیر چاہتے ہیں۔ میری اور آپ کی عمر میں کسی کو کیا پڑی ہے کہ اس چکر میں پڑے اور وہ بھی تنظیم اسلامی کے پلیٹ فارم سے!"۔ ایک اور بزرگ و محترم قلمی معاون کراچی کے جناب نجیب صدیقی کا خط جو جماعت اسلامی کے سابق رکن ہیں اور حلقۂ ادب اسلامی کے اولین اراکین میں شامل تھے، پورا کا پورا قابل مطالعہ ہے:

"زندگانی کی گزرگاہوں میں" کے متعلق آپ نے جواب جس انداز سے مانگا ہے تو اس کا جواب ہے ضرور لکھیں ------ ضرور لکھیں ------ ضرور لکھیں ------

اس مضمون میں آپ جذباتی ہوگئے ہیں مگر جذبات میں قلم کی خوبصورتی اور نکھر گئی ہے۔ بقول شاعر

ان کو آتا ہے پیار پر غصہ
ہم کو غصے پہ پیار آتا ہے

اس کا ایک نقد فائدہ تو یہ ہوا ہے کہ ایک خوبصورت تحریر برآمد ہوگئی ہے۔ شگفتہ تحریر لکھنے والے میسر کہاں آتے ہیں۔ تنظیم والوں کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ ہم میں ایک شخص تو ہے جس کا قلم صفحۂ قرطاس پر پھول بکھیرتا ہے، ادب کی چاشنی، طنز کا نیا انداز، شگفتگی، سب کچھ تو موجود ہے۔ خشک تحریر پسند کرنے والے دو فیصد بھی نہیں ہوتے۔

ہر تحریر کو درسِ قرآن کی عینک سے دیکھنا کوتاہ بینی نہیں تو اور کیا ہے۔ ندائے خلافت کو معدودے چند لکھنے والے میسر ہیں، وہ بھی رپورٹنگ والے، تجزیہ نگار اور کچھ مترجم ہیں۔ تخلیقی صلاحیت والا اور کون ہے۔ یہ ایک بڑی کمی ہے جو ہر وقت محسوس ہوتی ہے۔ ہلکی پھلکی اور شگفتہ تحریر والے اگر ہمیں میسر ہوتے تو دعوتی لٹریچر کو کسی حد تک عوامی بنایا جا سکتا تھا۔ تصویر اگر بارِ گراں ہے تو چوکھٹے میں سے نکال دیجئے، اپنے قلم کی روانی کو نہ روکئے۔ غالبِ خستہ کے بغیر کام بند ہوں نہ ہوں، ایک خوبصورت تحریر سے ہم سب محروم ہو جائیں گے۔ میں نے سوچا تھا کہ آپ سے کہوں، پھر خیال آیا کہ کہیں بارِ خاطر نہ ہو کہ آپ اسے تو جاری رکھیں اس کے ساتھ ہی ایک دوسرا موضوع "اس صدی نے انسانیت کو کیا دیا" پر قلم اٹھائیں۔ اس کے بے شمار گوشے ہیں۔ ندائے خلافت کے پڑھنے والوں کو ایک دلچسپ موضوع ملے گا۔ پرچے میں صرف خشک تحریریں نہیں آنی چاہئے، دلچسپ مضامین کو بھی اس میں جگہ ملنی چاہئے۔ نصراللہ خاں عزیز مرحوم کی زیرادارت "کوثر" غالباً سہ روزہ پرچہ تھا۔ اس میں دعوت، ادب اور نکاتی کالم بھی ہوتا تھا جسے نصراللہ خاں عزیز مرحوم خود لکھتے تھے۔ اس میں سکھوں کے بے شمار لطیفے پڑھے ہیں"۔

اسی خط پر مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے ناظم اعلیٰ جناب سراج الحق سید صاحب نے جو خود بھی ایک بہت اعلیٰ ادبی ذوق رکھتے ہیں، یہ نوٹ لکھا ہے کہ "یا تو قارئین کی طرف سے ایسی خاموشی تھی کہ ہَول اٹھنے لگے یا ماشاء اللہ ایک ہی دن میں پانچ خطوط اور انتہائی تاکیدی کہ آپ لکھنا جاری رکھیں۔ ان حضرات کے ساتھ میں اپنی استدعا بھی شامل کرتا ہوں کہ لکھئے، ضرور لکھئے، لکھتے رہئے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ"۔

لاہور سے تنظیم اسلامی کے ایک فعال رفیق، محمد یونس صاحب کا خط پڑھ کر اندازہ ہوا کہ ہمارے بعض ساتھی اپنے مافی الضمیر کے اظہار پر، چشمِ بد دور، کتنی قدرت رکھتے ہیں۔ ایسے ساتھیوں کو مشق کے مواقع بہم پہنچانا بھی ہماری قیادت کی ذمہ داری ہے جو ان شاء اللہ تحریک ہی کا اثاثہ بنیں گے۔ مجبور ہو گیا ہوں کہ ان کا خط تقریباً پورا پیش کر دوں:

"آپ کو براہ راست خط لکھنے کا یہ پہلا موقع ہے اور اس کی وجہ آپ کا وہ کالم بنا ہے، جس کا عنوان ہے کہ "میں لکھوں کہ نہ لکھوں؟"۔ مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو کس نام سے پکاروں اور کیا لکھوں!

جناب اقتدار صاحب! میں ادب کا قاری نہیں ہوں۔ مولانا ابوالکلام کو جتنا تھوڑا بہت پڑھا، وہ میثاق وغیرہ میں ہی پڑھا ہے لیکن آپ کی تحریر پڑھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ آپ کا طرزِ تحریر انہی کی طرح کا ہے۔ دوسرا مزا اور لطف جو آپ کی تحریر پڑھ کر ملتا ہے، میں کافی عرصے تک اسے کوئی نام نہ دے سکا۔ کھٹی میٹھی سی تحریر، جیسے آلوچہ ہوتا ہے ویسی تحریر۔ آدمی کے اندر اترتی چلی جائے اور اسے احساس بھی نہ ہونے دے۔ شاید آپ برا مان جائیں لیکن آج بھی میں اسے کوئی نام نہیں دے سکا ہوں۔

آپ کی تحریروں میں، خصوصاً ان تحریروں میں جن میں آپ کوئی واقعہ بیان کرتے ہیں، میرے سامنے تو اس کی ایک تصویر بن جاتی ہے۔ اگر میں حوالہ دوں تو ایک شمارے میں آپ نے سعودی عرب میں شاہی خاندان کے شہزادوں کے صحرا میں ایک رقص کا حال بیان فرمایا تھا۔ (وہ صحرا نہیں بلکہ ینبع کی بندرگاہ اور دوسرے بڑے سعودی صنعتی مرکز کی تقریب افتتاح تھی، رقص کا انداز البتہ میری صراحت کے مطابق صحرائی تھا۔ ایڈیٹر) مجھے یاد ہے کہ میں نے اسے کئی بار پڑھا اور اپنے رفقاء سے اس کا تذکرہ بھی کیا تھا اور پرچہ نمبر ۶ میں جو دو تحریریں "بیجنگ کی تصویر" اور "انشورنس والا معاملہ" چھپی ہیں، بالکل لفظوں ہی لفظوں میں تصویر کھینچ دی ہے۔

میرے خیال میں تو آپ نے کئی بار خود میرے احساسات کو زبان دی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب آپ میثاق میں اداریہ لکھا کرتے تھے اس وقت شریعت بل کا معاملہ بڑے زور شور سے اٹھا تھا۔ میں تذبذب میں تھا کہ یہ سارا ہنگامہ تو صرف اخبارات میں نظر آتا ہے عوام میں نہیں۔ آخر کیا بات ہے؟ بے شمار باتیں ذہن میں اٹھتی تھیں۔ انہی دنوں آپ کا اداریہ میثاق میں آیا تو ایسے لگا کہ آپ کے لفظوں نے میرے احساسات کو زبان دے دی ہے۔ آپ نے لکھا تھا (مفہوم بیان کر رہا ہوں) کہ "عوام کو شریعت پر عمل کرنے کے لئے تیار کون کرے گا؟"

اب یہ بات تھوڑی سی کڑوی بھی ہو گی اور میں یہ بات خوب سوچ سمجھ کر لکھ رہا ہوں۔ میرے خیال میں ہماری تنظیم اسلامی عوام کے موجودہ مسائل سے، رجحانات سے اور رفقاء کے مسائل (معاشی معاشرتی) سے بھی لاتعلق ہے۔ اس کی بے شمار وجوہات ہیں۔ رسائل و جرائد کے حوالہ سے بھی وہ لاتعلق ہے۔ اسے نہیں علم کہ عوام میں جو رسائل چلتے ہیں ان میں کیسے کیسے مسالہ جات ہوتے ہیں۔ اگر ہمارا "میثاق" عوام میں نہیں چلتا تو اس کی بھی ایک وجہ ہے اور اگر "ندائے خلافت" کو بھی میثاق کی سطح پر لانا ہے تو ٹھیک ہے، ایسا ہی کرنا ہو گا جیسا کہ کیا جا رہا ہے لیکن اگر ندائے خلافت کو عوام میں چلانا ہے تو اس میں مختلف کالموں کا مزید اضافہ کرنا ہو گا، اسی طرح کے کالموں کا جیسے کہ "زندگانی کی گزرگاہوں میں" والے ہیں۔ میں تنظیم اسلامی لاہور وسطی کا ناظم ہوں اور احباب کو اپنے جرائد دیتا رہتا ہوں۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ رفقاء اور احباب مقابلتاً میثاق کم اور ندائے خلافت زیادہ پڑھتے ہیں اور اگر پوچھتے بھی ہیں تو یہ کہ ندائے خلافت کا پرچہ آیا ہے یا نہیں؟"۔

جناب اقتدار صاحب! ان ساری باتوں کا مطلب یہ ہے کہ آپ ضرور بہ ضرور لکھیں۔ ویسے بھی تو ندائے خلافت کے تازہ شمارے میں آپ کے دو تین مضمون تو ہیں۔ ابھی ہمارے رفقاء اور اکابرین کو اندازہ نہیں کہ ان چیزوں کی کتنی ضرورت ہے۔ باقی باتیں پھر سہی"۔

صادق آباد سے حافظ محمد خالد شفیع نے ارشاد فرمایا ہے کہ ابتدا سے "ندا" کو خرید کر پڑھتے رہے اور اب بھی "ندائے خلافت" کو ایک ہی نشست میں پڑھ لینے کے بعد صرف "زندگانی کی گزرگاہوں میں" کو دوسری بار بھی پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ تصویر پر اعتراض بھی ان کے نزدیک ایک زیادتی ہے۔ ان کا حکم ہے "تو جناب لکھو، لکھو اور ضرور لکھو، ہمت کے ساتھ لکھو، حوصلے کے ساتھ لکھو، صبر کے ساتھ لکھو اور مسلسل

لکھو" جس کی تعمیل کے لئے شاہیں کا تجسس اور چیتے کا جگر چاہئے۔ پشاور سے انجینئر طارق خورشید صاحب کا مکتوب بس ان الفاظ پر مشتمل ہے کہ "لکھئے اور خوب لکھئے۔ You have a unique style اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ"۔ ملتان سے محمد مشتاق احمد نے بڑے کام کی بات لکھی کہ "یہ ضروری تو نہیں کہ ہر قاری خط لکھ کر آپ کی حوصلہ افزائی کرے۔ اگر حوصلہ شکنی میں کچھ خطوط آئے ہوں گے تو یقیناً اس سے زیادہ حوصلہ افزائی میں بھی آئے ہوں گے۔ آپ لکھیں، لکھیں ضرور لکھیں"-- بھائی! رونا تو یہی تھا کہ حوصلہ شکنی کے خط بھی بہت راہ دکھاتے تھے۔

اسلام آباد سے عارف اعوان صاحب نے میرے تجربات اور سیاحت کے حالات کو گھر بیٹھے مل جانے والی نعمت قرار دے کر لکھا ہے کہ "ویسے آپ بھی "میرِ سادہ" واقع ہوئے ہیں کہ تمام قارئین کی رائے لینے چلے ہیں کہ اب میں لکھوں کہ نہ لکھوں؟۔ اکثریت تو خاموش ہوا کرتی ہے جو تعریف اور مذمت دونوں کو "پی" جانے کی قائل ہوتی ہے"۔ کراچی سے عبدالواحد عاصم صاحب نے فرمایا ہے کہ "آپ کی (اس نوع کی) تحریروں کا سلسلہ بے حد مفید اور معنی خیز ہوتا ہے۔ پڑھنے کے بعد ہمیشہ آپ کے لئے دعائے خیر نکلتی ہے' دل کی گہرائیوں سے آپ کی صحت و ایمان اور تاثیرِ تحریر میں اضافے کے لئے بے ساختہ دعائیں ---- میری اہلیہ بھی آپ کے مضامین نہائت دلچسپی سے پڑھتی ہیں"۔ کسی نامعلوم مقام سے عبدالمجید شیخ صاحب نے میری تحریروں کی تحسین فرمانے کے بعد آخر میں بڑی بے تکلفی برتی ہے "اجی اقتدار احمد صاحب' آپ خواہ مخواہ کچھ لوگوں کی باتیں دل کو لگا بیٹھے ہیں' اٹھئے صاحب قلم پکڑ کر ہماری مطالعے کی پیاس کو اپنی بھرپور تحریروں سے تسکین پہنچایئے"۔

کراچی سے قوم کی ایک میمن بیٹی رضیہ ہارون کے خط سے بھی قارئین کو محروم رکھنے پر طبیعت آمادہ نہیں ہوتی جس کی مادری زبان ظاہر ہے کہ' اردو نہیں۔ الحمدللہ کہ اسلام میں ستروحجاب کی وہ بہت خوب مزاج شناس ہیں' اللھم زد فزد :

"جنابا ۱۵/ اگست کا ندائے خلافت پڑھا۔ اب میں لکھوں کہ نہ لکھوں کا جواب ہے' لکھئے لکھئے ضرور لکھئے اور وہ سب کچھ ہمیں بتایئے جو آپ کے سینے میں محفوظ ہے۔ ہمیں ان سب کی سخت ضرورت ہے۔ میری عمر تقریباً ۳۰ سال ہے' میں آپ کو اپنے والد کی عمر کا سمجھتی ہوں' آپ ہمارے لئے بزرگ ہیں' ایسے ہی بزرگ جیسے ہم درسی کتابوں میں پڑھتے آئے ہیں۔ ہم عصر لوگوں نے غالب کی کونسی قدر کی لیکن بعد کے آنے والوں نے ان کی قدر پہچانی۔ آپ کی زندگانی کی گزرگاہیں ہمیں روشنی کا پیغام دیتی ہیں۔ انتھک محنت' جدوجہد' اچھی خاص دولت ہونے کے باوجود گھمنڈ نہ ہونا بلکہ اسلام پر کاربند رہنا' عیاشی اور فضول خرچی سے اجتناب' پیسے کا صحیح استعمال' اونچے لوگوں سے تعلقات پر نہیں اللہ پر توکل اور ایسے درجنوں سبق ہیں جو ہم اس سے حاصل کرتے ہیں۔ نہ صرف حاصل کرتے ہیں بلکہ دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔

میں اس مضمون کو اس طرح پڑھتی ہوں جس طرح کھانے کے بعد سویٹ ڈش۔ ہم میمن ہیں' ہمارے ہاں دعوتوں میں سویٹ ڈش کھانے کے شروع میں کھلائی جاتی ہے۔ میں میٹھے کی بہت شوقین ہوں اور زندگانی کی گزرگاہوں کو بھی ایسے ہی پڑھتی ہوں کہ سب سے پہلے اداریہ پھر زندگانی کی گزرگاہوں میں۔ ندا کی اس وقت سے قاریہ ہوں جب یہ ندائے خلافت نہیں صرف ندا تھا۔

آپ کی ہر تحریر کی بہت ہی مداح ہوں اور اکثر سوچتی ہوں کہ یہ اداریے تو درسی کتابوں میں ادبی مضامین کی جگہ ہونے چاہیں۔ کیونکہ نویں' دسویں' فرسٹ ایئر اور انٹر میں میں نے جیسا کچھ ادب پڑھا ہے' اس سے یہ لاکھ درجہ اعلیٰ' بامقصد اور ذہن کو جلا بخشنے والا ہے۔ مجھے ڈاکٹر صاحب سے بیعت کئے ہوئے ۱۰ سال ہو گئے ہیں۔ اسی وقت سے "میثاق" اور "حکمت قرآن" کی بھی باقاعدہ قاریہ ہوں۔ ہزار بار (آپ کے اداریے پڑھ کر) داد دینے کو اور خط لکھنے کو جی چاہا۔ سوچا کیا فرق پڑتا ہے۔ باپ کی عمر کے ایک شخص کو خط لکھ کر لیکن ڈاکٹر صاحب کے دروس اور ستروحجاب کی تعلیمات قلم روک لیتی تھیں اور پھر کچھ کاہلی بھی' اور یہ بھی ڈر کہ تکلف سے لکھنا نہیں آتا۔ اب تو آپ ہی نے کہا ہے کہ خاموشی کا مطلب یہ لوں گا کہ بہت ہو چکا"۔

پشاور سے جناب وارث خاں صاحب اور کالج کے ایک استاد محمد جمشید صاحب نے علیحدہ علیحدہ پوسٹ کارڈوں کے ذریعے میری حوصلہ افزائی فرمائی ہے۔ ایک زمانے کے بعد "پوسٹ کارڈ" نظر سے گزرا۔ میں نے تو آخری پوسٹ کارڈ تب استعمال کیا جب وہ تین (پرانے) پیسے کا ہوتا تھا۔ دونوں کے جذبات قابلِ قدر ہیں اور میرے شکریہ کے مستحق!۔ پشاور ہی سے میجر (ر) فتح محمد صاحب نے بہت خوب لکھا ہے کہ "محترم! اللہ تعالیٰ آپ کو صرف اور صرف اللہ کی رضا کے لئے لکھنے کی توفیق دے اور اس کو جاری رکھنے کی توفیق بھی عطا فرمائے' آمین ثم آمین - امید ہے کہ آپ اپنی تحریروں میں وہی دلچسپی برقرار رکھیں گے جیسی رکھتے ہیں۔ دعاگو ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کے دل کے میل کو صاف کردے۔ آمین"۔ میجر صاحب! آپ نے بجا لکھا' یہ دل کا میل ہی تھا۔ نکل گیا تو اچھا ہی ہوا نا!۔ تمرگرہ' ضلع دیر سے جناب محمد فہیم نے لکھا "آپ کے سفرناموں میں بہت سی چیزیں ملتی ہیں اگر دیدۂ عبرت نگاہ ہو۔ بہت پہلے جب آپ نے بیروت کی اپنی سیر میں وہاں کے حالات کی نقشہ کشی کی تھی تو مجھے ایسا لگتا تھا کہ میں بالفعل وہاں موجود ہوں کیونکہ آج سے ٹھیک ۲۴ سال پہلے میں بھی ان گلیوں بازاروں سے گزرتے ہوئے وہاں کا سماں دیکھ چکا ہوں۔ آپ لکھیں اور ضرور لکھیں---- جو کچھ میں نے لکھا یہی احساسات میرے ہم نشیں ساتھیوں کے ہیں جو ندائے خلافت کے ساتھ متعارف تو ہیں' باقاعدہ خریدار ہوں یا نہ ہوں"۔ فہیم صاحب نے فوٹو چھاپنے کی حمایت کی ہے۔

قلعہ کالر والا تحصیل پسرور ضلع سیالکوٹ کے ڈاکٹر اکرام علی اظہر کا دل دکھانے پر احساس جرم کا شکار ہو گیا ہوں۔ اللہ کے اس سادہ دل بندے نے تحریر کیا ہے کہ :

"ابھی ندائے خلافت موصول ہوا۔ سب سے پہلے آپ کی تصویر نہ دیکھ کر بڑی حیرت اور دکھ ہوا۔ سب سے پہلے یہ ٹاپک پڑھا۔ یقین کریں آنکھوں سے بہت آنسو برسے۔ کیا اس گھٹا ٹوپ اندھیر نگری میں آپ جیسے ٹمٹماتے ستارے بھی یہ پوچھ رہے ہیں کہ لکھوں کہ نہ لکھوں۔ میری عمر تو ابھی ۲۸'۲۷ سال ہے لیکن دعا ہے کہ ہماری عمر بھی آپ کو لگ جائے۔ یقین کریں انشورنس والی کہانی تو میں نے کئی لوگوں کو سنائی۔ آپ لوگ خدا کے سامنے کچھ منہ لے کر جائیں گے' ان شاء اللہ اور ہم گواہ ہیں کہ آپ ان مایوس کن حالات اور گھٹا ٹوپ اندھیروں میں سچائی کی شمع جلانے میں مصروف ہیں۔ اللہ آپ کو صحت دے اور ہم پر آپ کا سایہ تاحیات رہے۔ اور کم از کم آپ کبھی بھی اس طرح کی مایوسی اور بددلی کا شکار نہ ہوں' بلکہ جذبہ کے ساتھ ہمیں راستہ دکھلاتے رہیں۔

میں نے چند سیکنڈ کا ادھار بھی نہیں کیا' یقین کریں برستی آنکھوں کے ساتھ یہ الفاظ لکھ رہا ہوں۔ اللہ کرے آپ کی تصویر بھی اسی طرح پرچے میں آئے اور کالم بھی مسلسل چھپتا رہے (آمین)"۔

پشاور سے جمیل اختر صاحب نے تحریر فرمایا کہ "امید ہے کہ اس سوال کے جواب میں آپ کو بہت خطوط موصول ہو رہے ہوں گے۔ مجھے آپ کے وقت کی قیمت کا احساس ہے اس لئے نہائت ہی مختصر جواب لکھ رہا ہوں کہ لکھو' لکھو اور ضرور لکھو"۔ لاہور

سے الطاف حسین صاحب نے ندائے خلافت کے اسی پرچے کے ریپر پر ہی لکھ بھیجا "لکھو، لکھو، پھر لکھو!!"۔ پشاور سے اشفاق میر صاحب نے تسلیم کیا "آپ کا گلہ سر آنکھوں پر لیکن لکھیں اور ضرور لکھیں"۔ لاہور سے قمر سعید قریشی صاحب کے اس مشورے کا ذکر تو اس رسید میں کر چکا ہوں جو فوری طور پر لکھدی تھی تاکہ سند رہے، کہ "اگر آپ کی تحریر (غالباً اداریے وغیرہ مراد ہیں۔ ایڈیٹر) میں سے طنز کی شدت کسی طرح کم کی جاسکے تو مقبولیت میں بھی ان شاء اللہ اضافہ ہوگا اور آپ کے مخاطب بھی شاید اثر قبول کرنے میں آسانی محسوس کریں" اپنے گرامی نامے کا آغاز انہوں نے اس طرح کیا "آپ کی تحریر، اب میں لکھوں کہ نہ لکھوں دیکھ کر بے ساختہ وہی جواب سوجھا جو پشاور کے اس پروگرام میں تھا جس کا خود آپ نے آخر میں ذکر کیا---- حضرت! لکھئے لکھئے، میں قربان، لکھتے ہی جایئے"۔

قرآن اکیڈمی لاہور کے شعبۂ تصنیف و تالیف سے منسلک ہمارے ساتھی (حافظ) خالد محمود خضر صاحب کا ارشاد ہے کہ :

"تازہ ندائے خلافت میں آپ نے "زندگانی کی گزرگاہوں میں" دل کے پھپھولے پھوڑنے کے بعد قارئین سے "اب میں لکھوں کہ نہ لکھوں؟" کا جو استصواب چاہا ہے اس سلسلے میں اپنا حق رائے دہی استعمال کرنا چاہتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ ندائے خلافت کے جن آرٹیکلز کا میں (قریباً) باقاعدگی سے مطالعہ کرتا ہوں وہ آپ کی ادارتی تحریروں کے علاوہ "زندگانی کی گزرگاہوں میں" ہی تو ہوتے ہیں۔ میری دانست میں اس دلچسپ اور معلوماتی سلسلے کو بہرطور جاری رہنا چاہئے۔ اگر ندائے خلافت کے صفحات آپ کی ادبی چاشنی کی حامل تحریروں اور سفرناموں سے محروم کردیئے جائیں تو پرچہ بالکل ہی پھیکا رہ جائے گا اور یہ قارئین کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔

"زبان یار من ترکی"۔ "بہت دلچسپ اور معلومات افزا سفرنامہ تھا۔ اس کا بقیہ حصہ پڑھنے کی شدید خواہش ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و توانائی عطا فرمائے کہ آپ نہ صرف اسے مکمل کریں بلکہ ہمیں چین و جاپان اور امریکہ کی سیاحت میں بھی شریک کریں۔ آپ کے سفرنامے اور دیگر تحریریں واقعتاً اس قابل ہیں کہ انہیں کتابی صورت میں شائع ہونا چاہئے۔ یہ اردو ادب میں یقیناً ایک گرانقدر اضافہ متصور ہوگا۔ اب تک منہ میں "گھنگنیاں بھرے بیٹھے رہنے" پر معذرت کے ساتھ ----------!"

گریڈوں کے نگر اسلام آباد سے انیسویں گریڈ میں ایک اچھے عہدے پر فائز میاں محمد وحید اختر صاحب نے جن کی ڈگریوں کا شمار مشکل لگا (ماشاء اللہ بی۔ ایس سی، ایل ایل۔ بی، ڈی۔ ایل۔ ایل اور معاشیات، علوم سیاسی اور اسلامیات میں ایم اے ہیں) سرکاری ملازمت سے عدم اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے اس تنگنائے سے نکل آنے کے ارادے کا ذکر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی الجھن دور فرمائے اور عزائم پورے کرے۔ میاں صاحب نے بھی تحسین فرماتے ہوئے لکھا ہے کہ میثاق، حکمت قرآن اور ندائے خلافت میں سے میری تحریروں جیسی چیزیں بھی خارج ہو گئیں تو بچے گا کیا؟۔ ارشاد ہے کہ "میری بیوی لاہور میں اردو کی لیکچرار ہیں" وہ آپ کے کالم کی ادبی چاشنی کی مداح ہیں" اور خط پر بطور عنوان لکھا ہے کہ "آپ سے گزارش ہے کہ اپنا کالم بند کرنے کا ظلم نہ کریں"۔ جوابی گزارش ہے کہ میاں صاحب بالخصوص "میثاق" اور "حکمت قرآن" کی ناقدری نہ فرمائیں۔ ہمارے فکر کی اساس تو انہی جریدوں کے کے کام پر استوار ہے

حسین رضا صاحب نے فیصل آباد سے تحریر کیا ہے کہ "زندہ ہوتے "زندگانی کی گزرگاہوں" کو بند کرنا کسی طور بھی مناسب نہیں بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ اگر اس جریدے کے آغاز تا ایں دم کو دیکھا جائے تو اس سے تنظیم اسلامی کی اجتماعیت کو جو مثبت و بامعنی فائدہ پہنچا ہے اس میں غالب حصہ آپ کی لکھار (تحریروں) کا ہے.... اور تصویر کے متعلق بھی آپ کا نقطۂ نظر صحیح تر ہے"۔ بھمبر (آزاد کشمیر) سے عبدالباسط فاروقی صاحب ایم۔اے عربی، رقم طراز ہیں۔ "میری ناقص رائے ہے کہ آپ لکھتے رہیں۔ میرے پاس "ندا" اور "ندائے خلافت" کے سارے پچھلے شمارے فائلوں کی صورت میں محفوظ ہیں اور موسم گرما کی تعطیلات میں (وہ حکومت کے شعبۂ تدریس سے متعلق ہیں۔ ایڈیٹر) میرے مطالعہ کا نصف سے زائد وقت "ندا" کو پڑھنے میں گزرا ہے۔ میرے خیال میں آپ کا یہ کالم بڑا مفید ہے، اسے جاری رہنا چاہئے.... نیز تصویر شائع کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں"۔ سرگودھا کے ڈاکٹر خالد محمود صاحب کا خط مختصر ہے اور اسی لئے پورا دے دینے میں بھی حرج نہیں۔ لکھا ہے کہ :

"جناب، میں ہفت روزہ ندائے خلافت کا باقاعدہ خریدار ہوں۔ ۱۵/اگست ۱۹۹۴ء کا شمارہ نظروں سے گزرا تو پتہ چلا کہ آپ ہماری طرف سے منتظر بیٹھے ہیں کہ ہم لوگ آپ کو لکھنے کی اجازت دیتے ہیں یا کہ نہیں۔ جناب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ اگر آپ نے دوبارہ لکھنا شروع نہ کیا تو ہمیں آپ سے شکایت رہے گی۔ آپ نے ترکی کے سفر نامے کی ۲ قسطیں لکھی تھیں مجھے بہت پسند آئی تھیں۔ امید ہے کہ آپ دوبارہ یہ سلسلہ شروع کرکے باقی قسطوں کو مکمل فرمائیں گے۔ شکریہ!"

پشاور سے غلام مقصود نے قصہ کوتاہ کرتے ہوئے لکھا "چونکہ آپ کا سوال بہت ہی مختصر ہے لہٰذا جواب بھی مختصر عرض ہے یعنی لکھو، لکھو اور لکھو" لیکن اپنے محترم بزرگ، کراچی کے شیخ جمیل الرحمن بھولا والے کا گرامی نامہ طوالت کے باوجود من و عن اشاعت کا استحقاق رکھتا ہے۔ "جنگ" کے میر خلیل الرحمن سے مل کر عنفوانِ شباب میں دلّی سے ایک فلمی قسم کا پرچہ نکالنے والے اور پھر "جنگ" دہلی میں بھی مرحوم کے ابتدائی شریک کار یہ پنجابی سوداگرِ دہلی آزادی کے بعد جماعت اسلامی کے شانے پر زلف بن کر لہرائے اور بعد ازاں تنظیم اسلامی کی تاسیس سے اب تک پیرانہ سالی کے باوجود قافلے کے ہراول دستے میں شامل ہیں۔ ان کی صحت و سلامتی کے لئے خاص دعاؤں کی درخواست کے ساتھ ان کا مکتوب گرامی پیش کر رہا ہوں :

"ندائے خلافت" کے تازہ شمارے میں "زندگانی کی گزرگاہوں میں" کے مستقل عنوان کے تحت آپ کا "درد دل" یا نوحہ یا شکوہ "اب میں لکھوں کہ نہ لکھوں؟" کے سوال کی صورت میں جاننے کا موقع ملا۔ ٹی وی کے جس پروگرام کے حوالے سے یہ طرز اختیار کیا گیا ہے اس کے پس منظر میں میرا مختصر جواب تو یہ ہے کہ "لکھو ضرور لکھو"۔۔ اس لئے کہ اس عنوان کے تحت آپ کی نگارشات میں راقم کے خیال میں بہت سے محاسن ہیں اور آپ کی اس کاوش میں نہ تو "ادب برائے ادب" کی کوئی جھلک نظر آتی ہے اور نہ ادب برائے زندگی" (ترقی پسند ادیبوں کی اصطلاح کے مطابق) کی تقلید بلکہ اس میں کم از کم مجھے تو وہ "مقصدیت" منہ بولتی معلوم ہوتی ہے جو آپ نے شعوری طور پر اختیار کی ہے اور ان تحریروں میں وہ روشنی پنہاں نظر آتی ہے جس سے راہ حق کی منزل کے نشانات راہ کو چشم بصیرت سے دیکھا جاسکتا ہے۔

مجھے اندازہ ہے بلکہ ذاتی طور پر علم ہے کہ آپ معروف معنوں میں نہ ادیب ہیں نہ صحافی۔۔۔ ماضی بعید میں ایک دعوتی جریدے سے مختصر عرصہ کے لئے آپ کا جو تعلق رہا ہے، وہ بھی "مقصدیت" میں ایک نوع کے تعاون کے جذبہ کا رہین منت تھا۔

ماشاء اللہ آپ پانچوں بھائیوں پر اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہوا ہے کہ ان کو جو صلاحیتیں دی گئی تھیں ان سے بھرپور استفادہ کے مواقع بھی اس نے عطا فرمائے۔ آپ خود اور آپ کے دو برادران دنیوی اعتبار سے انجینئرنگ کی اعلیٰ صلاحیتوں سے مالامال ہیں۔ آپ کے سب سے چھوٹے

بھائی ماشاء اللہ شعبہ تعلیم و تدریس جیسے بامقصد سلسلہ سے وابستہ ہیں' جہاں دعوت و تبلیغ دین کے لئے وسیع میدان اور بہترین مواقع حاصل ہیں۔ پھر یہ کہ وہ اور ان سے بڑے بھائی دونوں اس قافلہ میں آپ کے ہم سفر ہیں جو رضائے الٰہی کے حصول کے لئے تجدید و غلبۂ دین کے لئے رواں دواں اور استعداد بھر اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے کوشاں ہے۔

پھر یہ کہ آپ کے بڑے اور ترتیب کے لحاظ سے دوسرے بھائی محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ پر تو من لدن حکیم خبیر (سورہ ہود) کے مصداق یہ فضل عظیم ہوا کہ ان کا قلبی و فکری تعلق اپنی کتاب عزیز سے جوڑا' ان پر قرآن فہمی کی ارزانی فرمائی' قرآن کی آفاقی اور انقلابی دعوت ان پر منکشف فرمائی اور ساتھ ہی ان کو داعی الی اللہ کے منصب کی ذمہ داری اور فرض انجام دینے کے لئے شرح صدر عطا فرمایا۔ نیز حسب وسعت و استطاعت اسلامی تعلیمات پر عملی طور پر زندگی بسر کرنے کی توفیق و سعادت بخشی۔ آپ پر بھی یہ فضل ہوا کہ جہاں آپ کو ان کا رفیق بننے کی سعادت ملی وہاں آپ کی خداداد صلاحیت کو جلا بخشی اور جو خفتہ اور پیدائشی ادیب آپ کے اندر موجود تھا اس کے ظہور کے اسباب پیدا فرمائے۔ آٹھ دس سال قبل آپ کو "میثاق" کے اداریئے میں لکھنے کا موقع فراہم کیا اور پھر "ندا" اور اب "ندائے خلافت" کے ذریعہ سے آپ کے قلم میں پختگی اور نکھار پیدا کیا۔

آپ کے بقول چند مشاہیر ادب آپ کی نگارشات پر خراج تحسین ادا کر چکے ہیں۔ میری ناچیز رائے میں ان حضرات کی یہ رائے حقیقت پر مبنی ہے کہ آپ کے سفر ناموں کا ایک الگ انداز ہے' مشاہدات ایک منفرد زاویہ نگاہ کے حامل ہوتے ہیں۔ اس عاجز راقم کی بہت پہلے سے یہ رائے بن چکی تھی کہ آپ کے سفرنامے اور تجربات زندگی میں جہاں سلاست' شگفتگی' ادبیت ہوتی ہے (بالخصوص اشعار یا مصرعوں کے برجستہ استعمال کی) وہاں آپ کی نگارشات میں "مقصدیت" پوری طرح چھائی ہوتی ہے' اور عبرو بصائر تانے بانے کی طرح گندھے ہوئے نظر آتے اور پھول کی خوشبو کی مانند معطر معلوم ہوتے ہیں۔ سفر ناموں میں دعوتی و تحریکی نقطہ نظر سے نہ صرف معلومات حاصل ہوتی ہیں بلکہ تاریخ و فلسفہ تاریخ کے بڑے اہم گوشے بھی واشگاف ہوتے ہیں۔

میرے حلقہ احباب میں سے جو ندائے خلافت کے مستقل قاری ہیں' ان کے تاثرات بھی کم و بیش وہی ہوتے ہیں جن کا میں نے اظہار کیا ہے لہٰذا نہایت اصرار کے ساتھ میں عرض کروں گا کہ "لکھئے اور خوب لکھئے"۔

ایک آخری اور اہم بات --- وہ یہ کہ ہمارے دین کی تعلیم یہ ہے کہ آخرت میں ایک بندۂ مسلم و مومن کے جملہ اعمال کے نتائج "نیت" کے مطابق نکلیں گے --- وہ حدیث شریف آپ نے خود بھی پڑھی ہوگی اور بارہا سنی بھی ہوگی' جس میں ان تین طبقات کے آخرت کے انجام کی خبر دی گئی ہے جو دنیا میں شہید' عالم اور فیاض کہلاتے اور سمجھے جاتے تھے لیکن فتور نیت کے باعث یہ "اعمال" ان کے کام آنے کے بجائے ان کے لئے موجب سزا بن گئے --- لہٰذا میں پورے جذبہ نصح و خیر کے ساتھ یہ عرض کروں گا کہ اگر دل میں رائی کے برابر بھی قارئین سے داد' تحسین اور ستائش کی خواہش ہو (خواہ وہ خفتہ اور خفیف ہی کیوں نہ ہو) تو اس کو شعوری طور پر کھرچ کر نکال دیجئے اور اگر اس میں کامیابی نہ ہو تو بہتر ہو گا کہ لکھنا چھوڑ دیجئے چونکہ دینی اعتبار سے تصحیح نیت ضروری ہے اس میں کوئی خلل واقع ہوا تو یہ عمل رحمت کے بجائے زحمت بن سکتا ہے۔ اعیاذ باللہ من شرور نفس۔

اس موقع پر یہ بھی عرض کرنا نامناسب نہ ہو گا کہ ٹائٹل پر حدیث امروز کے عنوان سے آپ کا شذرہ اور اندر آپ کے اداریئے بھی بحمد اللہ نہایت مفید اور ایک پیغام' ایک نصیحت' ایک دردمندانہ پکار کے مصداق ہوتے ہیں --- اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔"

جس مختصر رسید کا ذکر آچکا ہے' اس میں عرض کیا تھا کہ شیخ صاحب کی آخری نصیحت کے بارے میں لکھنا (بلکہ اس سے پہلے اپنا جائزہ اور ذاتی محاسبہ کرنا) ضروری ہے۔ یہ آسان کام نہ تھا اور ابھی التواء میں ہی تھا کہ وہ لاہور تشریف لے آئے اور ملاقات میں جو کچھ فرمایا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ خط لکھنے کے بعد ہی مجھے خیال آیا تھا کہ نیت کے ضمن میں غلط لکھ بیٹھا ہوں' ایک اور خط لکھ کر وضاحت کردوں کہ ایک لکھنے والا اگر توجہ طلب کرتا ہے تو اس لئے کہ داد (یا بے داد) پائے بغیر وہ اپنا کام جاری رکھ ہی نہیں سکتا۔ یہ کوئی جسمانی مشقت نہیں جو آدمی مارے باندھے بھی کر سکتا ہو۔ ان کی اس وضاحت میں میری طرف سے اس سے بڑھ کر کوئی اضافہ درکار نہیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے حسنِ نیت سے نوازے اور دل میں اگر صلہ و ستائش کی کوئی تمنا ہنوز باقی ہے تو اسے بھی اپنے فضلِ خاص سے کھرچ ڈالے۔ کراچی ہی سے سید واحد علی رضوی صاحب نے بھی ازراہ کرم ایک طویل خط کے ذریعے میری حوصلہ افزائی فرمانے کے بعد افسوس کا اظہار کیا ہے کہ تنظیم اسلامی کے رفقاء نے ندائے خلافت کی اشاعت بڑھانے میں وہ سعی و جہد نہیں کی جس کا یہ پرچہ مستحق ہے۔

شیخوپورہ سے واجد علی خان صاحب کا صاف ستھرا مراسلہ یہ تقاضا کرتے ہوئے کہ میں ضرور لکھوں' پرچے کے لئے مفید مشوروں سے بھی نوازتا ہے جن کے لئے ان کا خصوصی شکریہ۔ شاکراللہ صاحب (تیمرگرہ ضلع دیر) نے میرے ناقدین کی اچھی طرح خبر لینے کے بعد لکھا ہے "بلکہ میں تو پرزور مطالبہ کرتا ہوں کہ آپ اس سفرنامے کو اپنے اصلی حالت یعنی جس طرح آپ کے قلم سے نکلتا ہے شائع کریں اور اپنے تصویر کے ساتھ شائع کریں کیونکہ آپ کا وہ تصویر جو ندائے خلافت میں شائع ہوتا تھا بہت پسند ہے"۔ (ووئے قربان! - ایڈیٹر) اور "میرا تو صرف یہی درخواست ہے بلکہ پرزور مطالبہ ہے کہ اس وقت تک لکھوں جب تک آپ کے قلم میں سچ لکھنے کی ہمت ہو اور جسم میں لکھنے کی طاقت ہو۔ (اس کے لئے آپ سلاجیت خالص بھجوایئے نا! - ایڈیٹر) بلکہ میں بھی کہتا ہوں کہ لکھوں۔ لکھوں' اور (خوچہ - ایڈیٹر) زندگی کی آخری سانس تک لکھوں"۔ ایسے معصوم و پرخلوص اصرار کے جواب میں بھی نہ لکھوں تو مجھ پر حیف!۔

فیروزوالا' شاہدرہ لاہور سے میاں محمد وکیل الدین میرے پرانے قدردان معلوم ہوتے ہیں۔ ہفت روزہ اردو صحافت پر ایک مرثیہ لکھنے کے بعد مرحوم "ندا" کو بہت یاد کیا ہے۔ میری تحسین میں انہوں نے بہت مبالغے سے کام لیا اور ناقدریٔ زمانہ کا شکوہ اس شعر کے ذریعے کیا ہے کہ۔

عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہلِ وطن
یہ الگ بات کہ دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ

ابوظبی سے محمد منیر احمد صاحب اپنی اور اہلیہ کی ترجمانی کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ ندا اور ندائے خلافت دونوں کے باقاعدہ قاری ہیں اور خواہش رکھتے ہیں کہ ندائے خلافت کے ساتھ ہی سابق "ندا" بھی چاہے کسی اور نام سے ہو' ضرور شائع ہو۔ دونوں میاں بیوی یونیورسٹی سطح کے تعلیم یافتہ ہیں لیکن لکھنے کے چور۔ ان کے گرامی نامے کے یہ دو چھوٹے حصے زیادہ قابل توجہ ہیں :

"البتہ ایک بات آپ کو مدنظر رکھنی چاہئے کہ آپ ندائے خلافت کے مدیر ہی نہیں' امیر تنظیم اسلامی کے بھائی بھی ہیں لہٰذا آپ کے ہر عمل پر کڑی نگرانی رکھنا ان لوگوں کا کام ہے جو امیر تنظیم کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے ہیں۔ مجھے خود بھی تجربہ ہے اس بھائی کے رشتہ نے آپ کا امتحان اور سخت کر دیا ہو گا۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ اس اجتماعیت میں باشعور نگران بھی موجود ہیں۔ بہرحال یہ ان کا اخلاص ہے اور آپ کا اخلاص یہ ہے کہ آپ تنقید کا مثبت جواب دیتے ہوئے حق پر قائم رہیں اور ندائے خلافت کا

حق تو یہی ہے کہ اس میں کام کی باتیں اس انداز سے شائع ہوں کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس میں دلچسپی لیں"۔

"اس میں تو مجھے شک نہیں کہ اکثر لوگوں کے نزدیک ندائے خلافت میں آپ کی "آپ بیتی" ایک مفید تحریر ہوتی ہے۔ البتہ خط لکھنے میں سب میرے جیسے ہی ہوں گے۔ بہتر ہوتا اگر آپ یہ تحریر فرماتے کہ جن لوگوں کو میری یہ تحریر ناپسند ہے وہ مجھے لکھیں تاکہ جائزہ لیا جائے۔ آپ شاید خود ہی جان چھڑانا چاہتے تھے کہ دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ (نکلا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب: ایڈیٹر)۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ معاملات میں بہتری پیدا کرے۔ البتہ گزارش یہی ہے کہ آپ کا مضمون جاری رہنا چاہئے یعنی آپ لکھیں"۔

کراچی ائرپورٹ سے محمد شعیب صاحب نے لکھنے کی فرمائش کے ساتھ ایک ملفوف دھمکی دی ہے۔ "اگر آپ نے یہ تحریر بند کردی تو ہو سکتا ہے کہ ہمارا ندائے خلافت پڑھنے کا ذوق ختم ہو جائے"۔ نیویارک (امریکہ) سے راحیل ملک صاحب کا دو صفحوں پر مشتمل فیکس مثبت تجاویز کے ساتھ ان کا یہ تاثر بھی نقل کرتا ہے کہ "اس آپ بیتی کے سلسلے میں جب سے آپ نے قلم اٹھایا' دیگر تحریروں میں بھی آپ کا اسلوب بہت بہتر ہو گیا ہے خاص طور سے "حدیث امروز" میں کم تر الفاظ میں بھرپور پیغام اور تاثر ملتا ہے۔ آپ شاکی لکھتے ہیں کہ احباب کا feed back آپ کو نہیں ملتا ہے۔ میں ذاتی طور پر اکثر لکھنا چاہتا تھا مگر فاصلہ ہونے کے باعث بعض issues پر چیزیں پھیکی پڑجاتی ہیں... باقی ماشاء اللہ ندائے خلافت اپنی بلوغت کے ایام میں داخل ہو چکا ہے' اس کا اپنا ایک انداز ہے"۔ شکاگو (امریکہ) سے جس محترم رفیق کے فون کا ذکر ابتدائی رسید میں کیا گیا تھا' وہ ہمارے سرگرم رفیق تنظیم انجینئر عطاء الرحمٰن ہیں۔ ان کا وطن مالوف حیدر آباد دکن ہے لیکن اب امریکی شہری ہیں۔ میری تلاش میں دو "لونگ ڈسٹنس" ٹیلی فون کالوں کے بعد انہوں نے مجھ سے بھی رابطہ قائم کر ہی لیا تھا۔ یہ آخری کال خاصی طویل بھی تھی' ڈالروں میں بھی ان کے خرچ کا مجھے اندازہ ہے' رولا (مزوری۔ امریکہ) میں ڈیڑھ مہینہ ذاتی ٹیلی فون رکھ کر خود تجربہ کر چکا ہوں۔

کراچی سے محمد سمیع صاحب نے میرے سوال کو صرف اس لئے جواب کے قابل سمجھا کہ "آپ نے لکھا ہے کہ خاموشی کو میں ٹکا سا جواب سمجھوں گا" اور اذنِ تحریر دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"ہم پر اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا احسان یہ ہوا ہے کہ اس نے ہمیں اقامت دین کی جدوجہد کے لئے چن کر ایک نمایاں مقام عطا کردیا ہے ایسے میں اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ ہم خود نمائی میں ملوث ہیں تو اس کو اس کی نادانی پر ہی محمول کیا جاسکتا ہے۔ رہی تصویر والی بات تو یہ "آرام دہ کیا دے گی جو تڑپا نہ سکے گی"۔ پتہ نہیں یہ مصرع برمحل ہے یا بے محل سرحال یاد آگیا تو لکھ دیا ہے"۔

کراچی ہی سے انجینئر نوید احمد صاحب رقم طراز ہیں کہ "لکھنے اور پڑھنے کے معاملے میں انتہائی سست ہوں لہٰذا ۱۵/اگست کے ندائے خلافت میں آپ نے جو سوال کیا ہے اس کا جواب دینے میں بھی تاخیر ہو گئی ہے... آپ سے درخواست ہے کہ مضامین لکھنے کا سلسلہ جاری رکھیں"۔ مانسہرہ سے محمد اورنگ زیب صاحب فعال زندگی کا بڑا حصہ امریکہ میں رہنے کے بعد اب اپنے اصلی وطن واپس آئے ہیں اور to the point بات کرنے کے عادی معلوم ہوتے ہیں۔ "آپ ازراہ کرم مضمون "زندگانی کی گزرگاہوں میں" ضرور لکھا کریں۔ یہ دلچسپ' informative اور سبق آموز ہوتا ہے"۔

مولانا الطاف الرحمٰن بنوی سکہ بند عالم دین ہیں اور بہت ثقہ مزاج رکھتے ہیں۔ قرآن اکیڈمی میں فقہ جیسے خشک مضمون کے اولین استاد تھے۔ ان کا گرامی نامہ مختصر ہے لہٰذا بطور تبرک بھی پورا شائع ہونا چاہئے:

"آج سے پندرہ بیس دن پہلے ندائے خلافت میں آپ کی ایک تحریر پڑھی تھی جس میں آپ نے قارئین سے اپنی تحریروں غالباً بالخصوص سفرناموں کے بارے میں اس سوال کا جواب طلب کیا تھا کہ میں لکھوں کہ نہ لکھوں۔ آپ لوگوں کی مہربانی اور انتہائی ذرہ نوازی سے مجھے ندائے خلافت' میثاق اور حکمت قرآن تقریباً تقریباً باقاعدگی سے مل رہے ہیں۔ ان تمام رسالوں کو اول سے آخر تک ایک ایک حرف دیکھتا ہوں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ میں ان کی تحریرات کو ادھورا پڑھ کر چھوڑوں۔ آپ یقین جانئے کہ آپ کے سفرنامے تو میں اس دلچسپی سے پڑھتا ہوں کہ جس رسالے میں یہ حصہ نہ ہو تو میں خاصا بوجھل ہو جاتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اجر عطا فرماوے۔ آپ ضرور لکھیں اور ہماری باصرار درخواست ہے کہ آپ لکھنے کو ہرگز موقوف نہ کریں۔ آپ کا لکھنا یقیناً آپ کے لئے ثواب اور ہمارے لئے کئی لحاظ سے رہنمائی اور علمی اضافے کا باعث بنتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی عمر اور اوقات میں برکت عطا فرماوے۔"

اب میں اپنے قدر دان قارئین کرام کے بارِ احسان سے تو ایک حد تک سبکدوش ہو گیا اور یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں گا کہ ان لوگوں میں تو شامل نہیں جو نبی اکرم ﷺ کے فرمانِ مبارک کے مطابق اپنے بھائی بندوں کی مہربانیوں کا شکریہ بھی ادا نہیں کرتے' ربّ کریم کی شکرگزاری کا حق خاک ادا کریں گے۔ چند باتیں اس طویل تحریر کے جواز میں بھی عرض کروں گا جن میں کوئی گہرا فلسفہ نہیں بگھارا جائے گا' سیدھی سادی حقیقتیں ہیں جو دلوں میں اترتی چلی جائیں گی خاص طور پر اس وجہ سے کہ اس راہ کے ہر مسافر کو ان سے کم و بیش واسطہ پڑتا ہی ہے جس نے گھنیری چھاؤں سے دامن چھڑا کر تپتی راہوں کی پکار پر لبیک کہا ہو۔

محمد رسول اللہ ﷺ کا ہمیں حکم ہے کہ "کن فی الدنیا کانک غریب او عابر السبیل" یعنی دنیا میں ایسے رہو جیسے کوئی اجنبی ہو یا ایک راہ چلتا مسافر (یا جیسے بھی آپؐ نے فرمایا)۔ اس حکم کی کسی بھی درجے میں تعمیل آسان نہیں' دین کی "غربت" کے زمانے میں اپنی کوئی ذاتی غرض رکھے بغیر اس کے غلبے کی کسی جدوجہد میں شریک ہونا تو بلا مبالغہ قیامت ہے۔ حضورؐ ہی کے ایک اور فرمان کے مفہوم میں ہمارے لئے بشارت تو ہے کہ دین ایک اجنبی شے کی طرح نمودار ہوا تھا اور پھر سے خود اپنے دیس میں بھی پردیسی ہو جائے گا' سو خوشخبری ہو ان "غرباء" کے لئے جو اس کا ساتھ دے کر خود بھی یہی غربت اختیار کرلیں' اپنے معاشروں میں اجنبی اور پردیسیوں کی طرح دیکھے جانے لگیں لیکن اس بشارت کا مصداق بننے کے لئے جس عزم و ارادے اور استقامت کی ضرورت ہے اس کا حصول بطورِ خود ایک مسئلہ ہے۔ اللہ سے صبر اور صلوٰۃ کے ذریعے استعانت اور "حبل اللہ المتین" یعنی قرآن حکیم کی مضبوط رسی سے اپنے آپ کو قوی و عزیز ذاتِ باری سے منسلک کرلینا تو خیر اس کے بنیادی لوازم میں سے ہیں' ہم سفر ساتھیوں کی طرف سے حوصلہ افزائی اور ڈھارس دلانا بھی کم ضروری نہیں۔ "نقد" سودوں کے پیچھے تو ایک دنیا دیوانہ وار لپک رہی ہے' اس "ادھار" پر کام کرنے والے کتنے ہوں گے جو ساتھیوں کے اس تعاون کے بغیر بھی بطیب خاطر اپنی دھن میں لگے رہیں۔ ہاں' ایسے اولوالعزم لوگ بھی ہر زمانے میں موجود تو ہوتے ہیں لیکن کتنے! بس انگلیوں پر گنے جاسکنے کے قابل۔ یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا' دوسرے رہروانِ شوق کی آڑ میں پیچھے پیچھے چلنے والے مجھ ایسے کمزور لوگوں کو تو اس بلندی سے نگاہوں کو شاد کام کرنے کے لئے اپنی ٹوپیاں سنبھالنی پڑتی ہیں۔ ہم خاک نشینوں کا حال تو یہ ہے کہ

"حضرتِ داغ جہاں بیٹھ گئے' بیٹھ گئے"۔ اب کوئی اللہ کا بندہ ہی آکر اٹھائے تو اٹھیں۔

بایں ہمہ "غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں"۔ بیٹھے ہی ہیں' بھاگ تو نہیں گئے۔ ان کو پھر سے اپنے قدموں پر کھڑا کر کے کمر ہمت کسنے اور جادۂ حق کے خارزار پر پھر سے قدم بہ قدم چل نکلنے پر آمادہ کرنے کے لئے جھوٹوں ہی سہی' شاباش اور تھپکی دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو ساتھی یہ کام سچے دل سے کرے گا' اسے اپنے اللہ کی طرف سے اجرِ عظیم کی امید رکھنے کا حق ہے کیونکہ فی الحقیقت یہ بھی اس کے کام ہی کا ایک حصہ ہے جبکہ اس کام کو قیادت کی اوپر سے نیچے تک سب تہوں کے تو بنیادی فرائض میں شامل سمجھا جانا چاہئے۔ کاروبار اور دنیاوی دھندوں کی تو بات ہی اور ہے جہاں مَن برستا ہے' خدمت کی آڑ میں لوگ سیاست' سیادت' صحافت' بہبودِ عوام اور تعلیم و تعلم کے میدانوں میں "کامیابیوں" کے جو جھنڈے گاڑ رہے ہیں' کیا وہ اندھوں کو بھی نظر نہیں آتے؟۔ اور انہی پر بس نہیں' خود دین کے نام پر قائم دکانوں کے شوکیس نگاہوں کو خیرہ نہیں کرتے؟۔ کتنی ہی دینی (سیاسی و غیر سیاسی) جماعتوں اور گروہوں سے وابستہ چلتے پرزے دیکھتے ہی دیکھتے قبولیتِ عوام' شہرتِ دوام اور "شوکتِ اسلام" کے زینے چڑھتے چلے گئے۔ وہ کارکن جو کل تک جوتیاں چٹخاتے پھرتے تھے قالین پر چلتے بھی اب تلوے چھلنے کی شکایت کرتے ہیں۔ راہوں میں پڑے بیکار لوگ اب "کاردار" بلکہ کارساز ہیں۔ اپنے ہی سارے دلدر انہوں نے دور نہیں کرلئے' ساتھیوں کو خیرات بھی دیتے اور دوستوں کی مدارات بھی کرتے ہیں۔ کیا "مَن انصاری الی اللہ" کی پکار پر جمع ہونے والوں کو اس صورتِ حال اور زمانے کے اس چلن کا علم نہیں؟ اور خود ہم سے بہتر کون جانتا ہوگا جن پر یہ واردات گزر رہی ہے کہ احیائے اسلام' اقامتِ دین اور قیامِ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کی جاں گسل جدوجہد سے ہمیں "نقد" کیا مل رہا ہے۔ وعدہ خوشنودیٔ رب اور نجاتِ اخروی کا ہے (اور اس سے بڑی خوش بختی کیا ہوگی) لیکن ہے تو اُدھار۔ زمانے میں تو "نو نقد نہ تیرہ ادھار" کا اصول کار فرما ہے' یہاں نقد نو بھی نہیں ملتے' اُلٹے پلّے سے دینے پڑتے ہیں۔ (اللہ کو قرضِ حسن کے طور پر۔ سبحان اللہ!)۔

ہمارے ساتھی حسبِ استطاعت و مقدرت اپنی خون پسینے کی اکثر صورتوں میں محدود کمائی میں سے مخصوص حصہ نکال کر اپنی تحریک کو پیش کرتے ہیں۔ زیادہ اور حسبِ ضرورت نہیں تو چلئے تھوڑا اور بہت ناکافی سہی' اپنا وقت بھی نکالتے ہیں۔ ایک خاص وضع قطع اور طرز زندگی یعنی life style اختیار کر کے اپنے ماحول میں اجنبی بلکہ خاندان میں "نکو" بن جاتے ہیں اور اپنی کم کوشی پر ہر اجتماع میں قائدین کی طرف سے جھاڑنے جھٹکنے کے عمل سے جو گزرتے ہیں سو الگ!۔ خود احتسابی کے نتیجے میں احساس جرم لئے چور بنے پھرتے ہیں اور اللہ کو بھی "شرمسار" کرتے ہیں وہ الگ!۔

روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل
آپ بھی شرمسار ہو' مجھ کو بھی شرمسار کر

اور اس سب ایثار و قربانی' تگ و دو اور اپنی اجتماعیت کے علاوہ اللہ میاں کے سامنے بھی "ڈھیٹ" بننے کے بعد انہیں یہاں نقد کیا ملتا ہے؟۔ کوئی مالی مفاد؟ نہیں۔ جماعت میں چودھراہٹ؟ نہیں۔ معاشرے میں واہ وا؟ نہیں۔ اقتدار کا جھولا جھول سکنے کا کوئی امکان؟ نہیں۔ شہرت و ناموری!!! نہیں۔ ان کی جو آرزو رکھے وہ کافر---- بلکہ وہ تو بعد کی بات ہے' پہلے بے وقوف اور عقل سے پیدل----- کیونکہ ان دنیاوی نعمتوں کے حصول کا تو یہاں دور دور کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ جس تنظیم میں چار پانچ رفقاء پر مشتمل اُسرے (یعنی نظم کی بنیادی اکائی) کی نقابت (یعنی سربراہی نہیں بلکہ زمہ داری) تک کا منصب بھی اکثریتی رائے کو "ہموار" کر کے نہ مل سکتا ہو بلکہ نظم کی بالاتر سطح کی صوابدید پر منحصر ہو' اس میں جو آتا ہے کچھ دینے کے لئے ہی تو آتا ہوگا۔ لینے کے لئے یہاں ہے کیا؟--- چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں!۔

پھر اس قافلے کی منزل کو تصور میں بھی لانا' اللہ اللہ لانا ہے جوئے شیر کا' بعد از مرگ رضائے رب کا حصول اور پیش از مرگ اقامتِ دین' غلبۂ دینِ حق' اعلائے کلمتہ اللہ!۔ اصل مطلوب و مقصود بعد از مرگ والا ہدف ہے جس کے سلسلے میں اتنی احتیاط نہ برتی جائے کہ "لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام" تو سارے کئے دھرے پر پانی پھر جاتا ہے۔ برسہا برس کی محنت اور بے حساب ایثار کی کمائی خلوص و اخلاص کے شیشے میں ذرا سا بال آنے پر بھی لٹ کر رہ جاتی ہے چنانچہ استغفار کے پہرے اور انابت الی اللہ کی چوکی کا ہر آن بندوبست رکھنا ضروری ہے۔ دنیاوی منزل یعنی اقامتِ دین کا معاملہ اس سے بھی زیادہ مخدوش ہے۔ پورے کرۂ ارضی پر حالات کہیں بھی اس کے لئے سازگار نہیں جبکہ پاکستان میں یہ منزل "نظراں توں نیڑے' قدماں توں دُور" ہوتی چلی جا رہی ہے۔ یہاں جو بھی اٹھتا ہے' بات تو اسلامی انقلاب کی کرتا ہے لیکن اپنے توہمات میں الجھ کر رہ جاتا ہے اور اس کے بچوں کے سے کھیل میں اُڑائے ہوئے گرد و غبار نشاناتِ راہ کو پھر سے اوجھل کر دیتے ہیں۔ یہاں کے مقابلے میں دوسرے مسلمان ممالک میں آزمائش اتنی کڑی نہیں۔ ان ملکوں میں سے کسی کی ولدیت اسلام نہیں' اکثر تاریخ کے بطن سے پیدا ہوئے' بعض کو جغرافیائی مصلحتوں نے جنم دیا اور متعدد نسلی و لسانی بوقلمونی کے نشان ہیں۔ اسلام کو ان میں سے کسی نے یوں اپنایا نہیں' invoke نہیں کیا' جیسے ہم کر بیٹھے یا اس پر مجبور ہو گئے تھے۔ پھر اپنے کہے سنے کو ایک ہی دفعہ معاف کروا لینے کے بجائے "قوم" نے اسلام کی طرف جتنی کچھ "پیش قدمی" کی وہ اُلٹی گلے پڑ گئی۔ لو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا۔ اب قول و عمل میں تضاد کو بڑھاتے چلے جانے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہا جو نفاق کے مہلک مرض کی جڑ ہے۔ یہ جڑ ہمارے معاشرے میں گہری اتر گئی اور تناور درخت بن کر اب خوب برگ و بار لا رہی ہے۔ نفاق زدہ معاشرے میں مذہب کی آرائشی محرابیں تو کھڑی کی جا سکتی ہیں' اصل دین کے کام کی سوچتے بھی پسینے چھوٹتے ہیں۔ ایسے میں دین کے لئے بالفعل محنت کرنا اور کرتے چلے جانا خالہ جی کا گھر تو نہیں' انہی کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیادا!۔

قصہ مختصر' ان مشکل حالات میں اس راہ کے مسافروں اور اپنے قافلے کے گنے چنے ہمراہیوں کے لئے ایک دوسرے کا خیال رکھنا از بس ضروری ہے۔ میرے جیسے عام کارکن کی سادہ سمجھ میں اس کے چار طریقے آتے ہیں' اس سے آگے کی فکر اور چارہ گری ہمارے اہلِ علم قائدین کریں۔ ایک' اللہ تعالیٰ اور اس کی کتابِ ہدایت سے قریب ترین قلبی و ذہنی تعلق۔ دو' کارکنوں کا ذاتی اور گھریلو سطح پر باہم ربط و ضبط۔ تین' راست انداز میں تھوڑا یا بہت کام کرنے والے ساتھیوں کی حوصلہ افزائی اور چار' اپنی خلوتوں میں ان رفقاء کے لئے خصوصی دعائیں جن کے قدم ڈگمگاتے نظر آئیں ------ اور ظاہر ہے کہ اس استدعا میں زیادہ زور حوصلہ افزائی پر ہے جو میرے نزدیک ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بن جایا کرتی ہے۔ یہ محض اتفاق نہیں' یقیناً اللہ تعالیٰ کے اذن سے ہوا اور اس میں

(باقی صفحہ ۳۵ پر)

"ہمیں علماء کی خاموش تائید حاصل ہے"

افکارِ تازہ کی یہ ہوا کیا سعودی حکمرانوں کو راس آئے گی؟

۳ / مئی ۱۹۹۳ء کو علمی شعبے سے تعلق رکھنے والے افراد اور اسلامی سکالرز کے ایک گروہ نے "لجنة الدفاع عن الحقوق الشريعه" کے نام سے ایک تحریک کا آغاز کیا' جس کا اصل مقصد اسلام میں انسانی حقوق کے اصول سے سعودی حکمرانوں کے انحراف اور خلاف ورزیوں کے بارے میں رائے عامہ ہموار کرنا ہے۔ اس تنظیم کے ترجمان پروفیسر محمد بن عبداللہ المصری اور ان کے ایک ساتھی ڈاکٹر سعد الرشید الفقیہہ گزشتہ اپریل لندن آئے تو "امپیکٹ" سے ان کی گفتگو ہوئی۔ جو مختصراً یہاں نقل کی جارہی ہے۔

س : اس تحریک کا پس منظر کیا ہے؟

ج : دراصل اس کی ضرورت تو بہت عرصہ پہلے سے تھی۔ جبر' ناانصافی اور حقوق سے انکار جب حد سے بڑھنے لگا تو بہت سے مفکر اور دانش ور جمع ہوئے تاکہ حکومت کے ذمہ دار حضرات کو توجہ دلائی جاسکے۔ ہمارا مقصد صرف نصیحت کرنا تھا۔ چنانچہ ہم نے اپنے آپ کو پریس وغیرہ سے الگ رکھا اور براہ راست متعلقہ حکام سے رابطہ کیا مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علماء کے خلاف حکومتی کارروائیوں میں تیزی آگئی۔ جب بعض سرکردہ علماء بھی اس کی زد میں آئے تو بات منظر عام پر آگئی۔ شریعت کی رو سے عوام کے حقوق کی بات کرنا منع نہیں بلکہ ہمارا فرض بنتا ہے۔ خود حکومت بھی ہمارے دلائل رد نہیں کر سکی۔ اس نے یہ بہانہ تراشا ہے کہ ہم ریاست کو کمزور کرنا چاہتے ہیں اس لئے حکومت ہمیں کچل دینا چاہتی ہے۔

س : لیکن سعودی عرب تو ایک اسلامی ملک ہے۔

ج : ایک اسلامی ریاست کیوں کر عوام کو عدل و انصاف اور ان کے حقوق سے محروم رکھ سکتی ہے۔ اس جانب حکومت کی توجہ دلانا اس کی خیر خواہی ہے نہ کہ مخالفت۔

س : کیا آپ کو علماء کی تائید حاصل ہے؟

ج : جہاں تک سرکاری علماء کا تعلق ہے وہ کھلے عام اس کا اظہار نہیں کرسکتے' مگر ذاتی طور پر وہ ہماری تائید کرتے ہیں۔ باقی دوسرے علماء کو وہ یہ حق ہی نہیں دیتے کہ وہ اپنی رائے کا اظہار کرسکیں۔ بہرحال ان کی ہمیں پوری حمایت حاصل ہے۔

س : سعودی عرب کی رو سے یہ ایک انتہائی اقدام شمار ہوگا اس سے پہلے آپ نے مذاکرات کا راستہ اپنایا تھا؟

ج : ہم کئی سال ریاض کے گورنر' شہزادہ سلمان' ولی عہد اور بادشاہ کے ساتھ ملاقات کی کوشش کرتے رہے مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ حکمران چاہتے ہیں کہ مذاکرات خفیہ ہوں اور وہ بھی ان امور پر جو وہ پسند کرتے ہیں اور ان لوگوں سے جو صرف ہاں میں ہاں ملانے والے ہوں۔ تاہم تحریک کے آغاز کے پانچ روز بعد شہزادہ سلمان کی دعوت پر ہم ان سے ملاقات کے لئے گئے مگر ان کا ایک ہی استدلال تھا کہ خلافت راشدہ کے بعد بھی تو ظلم ہوا تھا' مگر لوگوں نے بغاوت نہیں کی۔ ہم نے بتایا کہ ہم بغاوت نہیں کر رہے۔ ہم مسائل کا حل اور زیادتیوں کی تلافی چاہتے ہیں۔ اصل میں وہ صرف ان لوگوں کے نام معلوم کرنا چاہتے تھے جو اس تحریک کے روحِ رواں ہیں۔ اسی کے لئے وہ کوشش کرتے رہے۔

س : آپ نے شاہ سے ملنے کی کیوں کوشش نہ کی؟

ج : ہم نے بہت کوشش کی۔ ہم نے ان کی خدمت میں تحریری طور پر عرض کیا کہ دس افراد کا ایک وفد آپ کی خدمت میں پیش ہو کر بعض اہم معاملات پر کچھ عرض کرنا چاہتا ہے۔ شیخ عبدالعزیز بن باز کے ذریعے بھی کوشش کی۔ مگر کوئی جواب نہیں ملا۔

س : کیا ہفتہ وار مجالس میں بھی ملاقات مشکل تھی؟

ج : یہ مجالس اس لئے ہوتی ہیں کہ لوگ آئیں' شاہ کے ہاتھ' کندھے یا ناک پر بوسہ دیں۔ چائے نوش فرمائیں اور تشریف لے جائیں یا اپنا کوئی چھوٹا موٹا مسئلہ پیش کرکے حل کروالیں۔ کام کی بات سننے کو تیار نہیں ہوتے۔ ہم نے ولی عہد' عبداللہ سے ملاقات کی' مگر خود ان کی کوئی نہیں سنتا۔ ویسے وہ امریکیوں کی آمد سے خوش نہیں ہیں۔

س : امریکیوں کو سعودی عرب میں قدم جمانے کا موقع کیسے ہاتھ آیا؟

ج : بظاہر شاہ اس پر آمادہ نہیں تھے لیکن صدر بش کا فون تھا کہ شاہ عبدالعزیز کے ساتھ پہلے ہی ان کا معاہدہ ہو چکا تھا جس کی رو سے انہیں یہاں مداخلت کے لئے کسی اجازت کی ضرورت نہیں۔ اور یہ کہ وہ آرہے ہیں۔ لہٰذا انہیں آنے کی "دعوت" دینا شاہ کے اپنے مفاد میں ہوگا۔

س : گویا شاہ خود امریکہ کا قیدی ہے' تو آپ ان کی رہائی کے لئے کیوں کوشش نہیں کرتے۔

ج : یہ قیدی وہ خود بنے ہیں۔ ایران کے خلاف عراق کی مدد کرکے انہوں نے بحران پیدا کیا۔ ویسے بھی سیاسی طور پر یہ فیصلہ غلط تھا۔ مگر انہوں نے کسی کی بات پر کان نہ دھرا۔ وہ اپنے آپ کو عقل کل کا مالک سمجھتے ہیں۔ سعودی حکومت اور سعودی خاندان نے قومی دولت محلات بنانے' سونا جمع کرنے اور دوسرے فضول کاموں میں لٹا دی۔ جدہ میں جنگ کے دوران تعمیر ہونے والے "قصر السلام" پر گیارہ بلین ڈالر لاگت آئی۔

س : سعودی عموماً غیر سیاسی شمار ہوتے ہیں۔ عام آدمی ان باتوں کو کیسا محسوس کرتا ہے۔

ج : ۱۹۷۳ء تا ۸۲ء کے تیل کی خوشحالی کے دور میں روپے پیسے کی بہتات تھی۔ شاہی خاندان اور اس کے حواریوں کی لوٹ کھسوٹ کے باوجود پیسے کی کسی کے پاس کمی نہیں تھی' سوائے جیزان (Jizan) اور اس جیسے دوسرے دور دراز کے علاقوں کے' جو محروم رہے' لہٰذا کسی نے شاہی خاندان کی دولت کی طرف دھیان نہیں دیا۔

مثال کے طور پر الجبیل انڈسٹریل سٹی کی تعمیر سے قبل ساری زمین انہوں نے شہزادہ سلطان کو دے دی اور پھر خود ہی حکومت نے اسے حاصل کیا۔ شہزادہ سلطان نے ۲۳ بلین ریال میں اسے فروخت کیا۔ اس کھلے کے باوجود اس شہر کا تعمیر کیا جانا معجزہ سے کم

نہیں۔ اس سے آئندہ نسلوں کو بھی فائدہ پہنچے گا۔

۱۹۸۱ء ۔ ۸۲ میں جب شاہ خالد کی وفات پر شاہ فہد نے تخت سنبھالا تو یہ عروج زوال کی جانب رخ کر چکا تھا۔ چنانچہ شاہی خاندان نے جمع پونجی پر جو اس وقت سو بلین ڈالر سے کم نہ تھی' ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔ یہ ساری دولت نئے نئے محلات تعمیر کرنے یا پھر ایران' عراق جنگ میں لٹا دی گئی۔ ملک کے کسی شعبے میں اس دوران کوئی ترقیاتی کام نہیں ہوا۔ بلکہ جو کام ہوئے تھے وہ بھی دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے ضائع ہو رہے ہیں۔ اس سے عوام میں بددلی پیدا ہوئی ہے۔ لیکن سب سے اہم مسئلہ اسلام سے حکمران طبقہ کی بے اعتنائی کا ہے۔ شیخ عبدالعزیز بن باز کی بات کو بھی درخور اعتنا نہیں سمجھا جاتا حالانکہ وہ حکومت کے مفتی اعظم سمجھے جاتے ہیں۔ چنانچہ عوام پہلے تھے بھی تو اب غیر سیاسی نہیں رہے۔

سعودی حکومت کا یمن کے کیمونسٹوں' جنوبی سوڈان کے باغیوں یا الجزائر کے حکمران فوجی ٹولے کے ساتھ یارانہ سعودی عوام کے نزدیک اسلام کے حق میں نہیں۔

س : اس میں تو اختلاف کی گنجائش ہو سکتی ہے کہ حکمران کہاں تک اپنے فیصلوں میں حق بجانب ہیں۔ خواہ وہ خود ہی اس جال میں پھنسے ہوں' اصل مسئلہ تو غیر ملکی تسلط سے انہیں آزاد کرانے کا ہے؟

ج : اسی لئے تو ہم حکمرانوں کی تبدیلی کے بجائے ان کی پالیسیوں میں تبدیلی چاہتے ہیں۔ سلطان اگر آزاد ہونا چاہتے ہیں تو اس کا اس کے علاوہ اور کیا طریقہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے عوام کی آزادی کو تو تسلیم کریں۔ لوگ آزاد ہوں گے تو ان کی مدد کر سکیں گے۔ غلاموں سے آپ کیا توقع کر سکتے ہیں۔

س : آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی بات سنی جاتی؟

ج : ہم نے بہت چاہا اور ہم وہ باتیں اب بھی کہہ رہیں جن پر عمل درآمد بہت ضروری ہے۔ اب بھی وقت ہے کہ حکمران اپنی اصلاح پر آمادہ ہو جائیں ورنہ یہ اپنے آپ کو کبھی نہیں بچا سکیں گے۔ ہم ہر سال پندرہ بلین ڈالر بیرونی قرضوں پر' جو ایک سو بلین ڈالر ہو چکے ہیں' سود ادا کر رہے ہیں۔ تیل کی آمدن بیس بلین ڈالر رہ گئی ہے' جو آئندہ مزید کم ہو کر سود کی رقم ادا کرنے کے لئے بھی ناکافی ہوگی۔

س : ملک سے باہر جو دولت چھپا کر رکھی ہوئی ہے اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ج : سرکاری کھاتوں میں موجود رقوم سو سے کم ہو کر پانچ بلین ڈالر رہ گئی ہیں۔ جس میں سے صرف پانچ فیصد تک نکلوائی جا سکتی ہیں۔ جہاں تک شاہی خاندان اور اس کے حواریوں کی چھپائی ہوئی دولت کا تعلق ہے وہ کئی بلین ڈالر ہو سکتی ہے مگر اس کی صحیح حد کسی کو معلوم نہیں اور شاید کبھی معلوم نہ ہو سکے۔ کیونکہ شاہ ایران کی طرح جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ باہر رکھی ہوئی ناجائز دولت محفوظ ہے' اقتدار سے محروم ہونے پر ان کے ہاتھ نہیں آئے گی۔

س : شاہی خاندان نے یہ دولت کیسے جمع کی؟

ج : ان کی اپنی بھاری بھرکم تنخواہوں کے بعد جو شے بھی بچ رہتی ہے وہ ایک دوسرے کو تحفے میں یا "فروخت" کر دیتے ہیں اور بعد میں حکومت ان سے بھاری قیمت پر خرید لیتی ہے۔ کسی بھی کاروبار میں اپنی اجارہ داری قائم کر لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ویزے اور واک پرمٹ دولت کمانے کا بڑا اہم ذریعہ ہیں۔ باہر سے آنے والے کارکن عملاً اپنے نادیدہ "کفیل" کے غلام بن کر رہ جاتے ہیں۔

س : یہ صورت کب تک جاری رہنے کا امکان ہے؟

ج : معاشی بدحالی کے بارے میں تو یہ اندیشہ ہے کہ وہ زیادہ دور نہیں ہے۔ مصنوعی نوٹ اس لئے نہیں چھاپ سکتے کہ ڈالر کے مقابلے میں ریال کی قیمت کم ہو جائے گی۔

س : اصل طاقت کس کے ہاتھ میں ہے؟

ج : ساری طاقت شاہی خاندان کے پاس ہے۔ سیاسی طور پر شاہ اور ان کے حقیقی بھائی مثلاً سلطان' سلمان اور نائف تمام اختیارات کے مالک ہیں۔ ولی عہد' عبداللہ بالکل غیر ہیں۔ ان کے علاوہ وزیر مالیات محمد ابا الخیل ہیں جو شاہی خاندان کے مالی معاملات کے رازداں ہیں اور گزشتہ سترہ برس سے اس عہدہ پر برقرار ہیں۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ پوری وزارت میں صرف ایک فیکس مشین ہے جو وزیر کے کمرہ میں ہے۔ امریکی مشیروں کا بھی خاصا اثر ہے۔

(بشکریہ امپیکٹ انٹرنیشنل' اکتوبر ۹۴ء)

جماعت اسلامی کا تازہ بحران

یہ جماعت ہمیشہ ہی ایک متنازعہ تنظیم رہی ہے؟

ایک ”باہر والے“ تجزیہ نگار کی غیر جانبدارانہ رائے

—— کلیم اختر ——

اس امر میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ جماعت اسلامی پاکستان کی ایک اہم سیاسی جماعت ہے جس کی اساس اسلامی عقائد پر قائم کی گئی' اس تنظیم کے موسس مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم تھے جو ایک بہت بڑے مذہبی سکالر اور مفکر تھے اور صداقت یہ ہے کہ جب تک مولانا مرحوم بقید حیات رہے مولانا کی ذات گرامی اور جماعت اسلامی ایک ہی چیز کے دو نام تھے اور ان کے مشورے اور ہدایت کو اولیت حاصل رہی حالانکہ ان کی زندگی میں ہی جماعت اسلامی دو بار بحرانوں کا شکار ہوئی۔ اولین صدمہ اس تنظیم کو اس وقت پہنچا جب اس کے بنیادی اراکین میں سے مولانا منظور نعمانی' مولانا علی میاں اور ان کے رفقاء کار علیحدہ ہو گئے۔ پھر دوسرا حادثہ اس وقت پیش آیا جب مولانا امین احسن اصلاحی اور ڈاکٹر اسرار احمد بمعہ اپنے ساتھیوں کے جماعت اسلامی کو چھوڑ گئے اور اپنے الگ الگ ادارے قائم کر لیئے۔ جرائد جاری کئے اور اپنے مؤقف کے مطابق کام میں لگ گئے۔ مولانا منظور نعمانی اور مولانا امین احسن اصلاحی نے خالصتاً دینی امور و مسائل کی طرف توجہ دی اور عملاً سیاسیات سے گریزاں رہے جب کہ ڈاکٹر اسرار احمد نے اپنی جماعت تنظیم اسلامی اور تحریکِ خلافت پاکستان بھی قائم کی اور تعلیمی ادارے بھی جاری کئے' اخبار بھی نکالا اور عملاً مذہبی سیاست میں مصروف عمل ہو گئے

کہنا یہ ہے کہ جماعت اسلامی سے علیحدہ ہونے والے بزرگ اور مفکر جماعت اسلامی کو کوئی شدید ضعف نہ پہنچا سکے اور جب تک مولانا ابوالاعلیٰ مودودی زندہ رہے ان سب کا چراغ ان کے سامنے جل نہ سکا۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کے سیاسی فکر اور ان کی تنظیم کے بارے میں موافق اور مخالفت میں بہت کچھ کہا گیا ہے' ان کی جماعت کا تجزیہ بھی کیا گیا۔ پروفیسر محمد سرور جامعی مرحوم نے جماعت اسلامی کے بارے میں دو کتابیں لکھیں۔ خود ڈاکٹر اسرار احمد نے جماعت اسلامی کے رخ کردار پر نظر ڈالی ہے۔ چودھری خلیق الزمان' صفدر میر اور دیگر دانشوروں نے جماعت اسلامی پر ناقدانہ تبصرے لکھے اور کتابیں لکھ ڈالیں۔ غرضیکہ جماعت اسلامی پاکستان کی واحد جماعت ہے جس پر مفکرین اور دانشوران ملت اظہار خیال کرتے رہے۔ جہاں تک دینی عقائد کا تعلق ہے جماعت اسلامی عامتہ المسلمین کے جذبات و احساسات کی ترجمان اس حد تک رہی کہ مولانا مودودی مرحوم قیدوبند کی صعوبتوں سے لے کر دارورسن کی آزمائشوں تک گزر گئے۔

اس تمہید کا مقصد بتانا یہ ہے کہ اس سفر حیات میں جو شخص مولانا مودودی کے روز و شب کا مخلص ساتھی رہا وہ مولانا نعیم صدیقی ہیں' جن سے راقم کی یاد اللہ ہے اور جو اپنی ذاتی زندگی میں ایک نہایت ہی مشفق مرنجاں مرنج اور مخلص انسان ہیں اعلیٰ پایہ کے ادیب اور قلم کار ہیں' کئی اچھی کتابوں کے مصنف اور سب سے بڑی بات ایک نیک نام شخصیت ہیں۔ جب تک مولانا مودودی مرحوم اس کارگہ حیات میں رہے مولانا نعیم صدیقی نے وفاداری بشرط استواری اپنا فرض ادا کیا۔ ان کی وفات کے بعد بھی جماعت سے وابستہ رہے۔ حال ہی میں انہوں نے اپنی دیرینہ جماعت سے علیحدگی اختیار کر کے تحریکِ فکرِ مودودی کے نام سے ایک الگ جماعت بنالی ہے۔ گویا وہ بھی مولانا امین احسن اصلاحی اور ڈاکٹر اسرار احمد کے نقش قدم پر چل پڑے ہیں۔ مولانا نعیم صدیقی نے اس ضمن میں جو کچھ کہا ہے ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں ہے کیوں کہ جب کسی تنظیم کا بانی قائد یا عظیم لیڈر دنیا سے رخصت ہوجاتا ہے تو ازاں بعد اس کے رفقاء کار میں "کچھ اختلاف کے پہلو نکل ہی آتے ہیں" اور اپنے سائے میں وہ جن پتھروں کو گہنا کر لئے بیٹھا ہوتا ہے وہ اپنی اصل شکل میں سامنے آجاتے ہیں اور ایسا ہر سیاسی اور ہر مذہبی تنظیم میں ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا' کیونکہ جب کسی جماعت میں اندر سے ٹوٹ پھوٹ ہوتی ہے تو اس کا صاف مطلب ہوتا ہے کہ فقدان قیادت پیدا ہوگیا ہے۔.........

جماعت اسلامی میں یہ انقلاب کیوں آیا اس کی وضاحت مولانا نعیم صدیقی نے کردی ہے۔ انہیں جماعت کے اندر بنائی گئی دو تنظیموں پاسبان اور اسلامی فرنٹ سے گلے شکوے ہیں اور ان کے تئیں اس سے جماعت کی ساکھ اور وقار کو صدمے پہنچے ہیں اس لئے وہ جماعت اسلامی سے ہی الگ ہوگئے ہیں! چلو اچھا ہوا کہ انہوں نے اپنا دامن بچالیا اور فکر مودودی کی تبلیغ و اشاعت کا بیڑا سنبھالا اور عملاً سیاسیات سے الگ ہوگئے مگر سوال یہ ہے کہ کیا جماعت اسلامی نے مولانا نعیم صدیقی کی علیحدگی کو محسوس کیا ہے؟ ایک ہمدم دیرینہ کی جدائی کا انہیں غم ہوا ہے اور کیا ان اسباب پر غور و فکر کیا ہے جن کی طرف سے مولانا نعیم صدیقی نے اشارا کر کے علیحدگی اختیار کرلی ہے؟

سوال یہ ہے کہ جماعت اسلامی جس کے بانی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی تھے' اپنے بنیادی مقاصد سے ہٹ چکی ہے یا ہٹ رہی ہے یا اس میں کوئی تبدیلی لا رہی ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ جماعت اسلامی ہمیشہ ہی ایک متنازعہ تنظیم رہی ہے۔ قیام پاکستان سے قبل اس جماعت کا موقف اور کردار کیا تھا اس کے بارے میں ایک عرصہ دراز تک بحث و تمحیص جاری رہی اور بقول ڈاکٹر اسرار احمد "جماعت اسلامی کی اصل تحریک ۱۹۴۷ء میں حقیقتاً اور اصولاً ختم ہوگئی تھی۔ اس کے بعد جماعت اسلامی کی قومی جدوجہد کے ساتھ ساتھ اس ابتدائی تحریک کے کچھ اثرات ایک عرصے تک برقرار رہے لیکن اب یہ دم توڑ چکے ہیں۔ اب اس تحریک میں اگر کچھ باقی ہے تو وہ ان چند نیک دل مخلص لوگوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ جنہیں اس اصل تحریک کی دعوت نے کھینچا تھا اور جو ابھی تک جماعت اسلامی کی قومی تحریک کا دامن اس اصل تحریک اسلامی کے مغالطے میں تھامے چلے آرہے ہیں اور اب بھی اگرچہ ان کی اکثریت نے کچھ کھٹک محسوس کرلیا ہے لیکن سوائے چند کے کوئی نہیں جانتا کہ جسے سینے سے لگائے پھر رہے ہیں وہ ایک ایسی بے جان نعش ہے جس کی روح کبھی کی پرواز کر چکی ہے"۔ (ڈاکٹر اسرار احمد تحریری بیان بحیثیت رکن جماعت اسلامی پیش کردہ جائزہ کمیٹی اکتوبر ۱۹۵۶ء)

یاد رہے کہ ڈاکٹر اسرار احمد اور مولانا امین احسن اصلاحی نے ۱۹۵۷ء میں اجتماع ماچھی گوٹھ میں اپنے علاوہ ستر سے زائد افراد کے ہمراہ جماعت اسلامی کو چھوڑ دیا تھا۔ یہ سب باتیں اکتوبر ۱۹۵۸ء کے ایوبی مارشل لاء سے پہلے کی ہیں۔

۱۹۵۷ء سے لے کر ۱۹۷۹ء تک یعنی مولانا مودودی مرحوم کے تارنفس کے ٹوٹنے تک جماعت اسلامی کے اندرونی اختلافات اور خاموش انقلاب جماعت اسلامی کو نقصان نہ پہنچاسکے حالانکہ ۱۹۵۸ء کے مارشل لاء کے دور میں جماعت کے اندر حکومت کی سپیشل برانچ نے بڑے بڑے قلمکاروں اور خطیبوں کو ان کے ذریعہ معاش سے بے نیاز بنادیا تھا پھر حقیقت یہ ہے کہ دینی اور سیاسی میدانوں میں مولانا مودودی کا پرچم عزم ہمت لہراتا رہا اور وہ مرد مجاہد آمریت کے خلاف جمہوریت کی جنگ میں مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح کا ہم قدم اور ہم آواز رہا اور عملی طور پر یہ ثابت کردیا کہ اسلام میں عورت اگر برسراقتدار آبھی جائے تو کوئی حرج نہیں ہے!۔

ہماری ادنیٰ دانست میں مولانا مودودی کی جماعت کو اب نقصان پہنچا ہے۔ اس جماعت کی شائستگی کا چراغ آہستہ آہستہ مدہم ہو رہا ہے۔ جماعت اسلامی کے کارپردازوں کو اس پر غور و فکر کرنا چاہئے۔......

نہ معلوم مجھے مولانا نعیم صدیقی صاحب کے جماعت اسلامی سے یوں چلے جانے کا کیوں دکھ ہوا ہے؟ حالانکہ میرا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے کوئی واسطہ نہیں ہے سوائے اس کے کہ وہ جماعت اسلامی کے اندر باہر والے لوگوں کو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی عظمت اور شرافت' شائستگی اور حلیمی کا نمونہ نظر آتے تھے۔ جماعت اسلامی سے نکل کر مولانا نعیم صدیقی کچھ پاسکیں گے یا نہیں؟۔

البتہ جماعت اسلامی نے اپنے گہر یک دانہ کو کھودیا ہے' اسے واپس لانا چاہئے اس سے جماعت اسلامی کی آبرو میں اضافہ ہوگا' روٹھوں کو منانے میں کوئی حرج نہیں ہے اور جماعت میں اصلاح و تطہیر یا نظم و ضبط قائم رکھنا بھی ایک اچھی عادت اور روایت ہے مگر یہ سب تب ہوتا ہے جب بقول علامہ محمد اقبال میر کارواں میں خوئے دلنوازی ہو۔ فرماتے ہیں۔

کوئی کارواں سے ٹوٹا کوئی بدگماں حرم سے
کہ میرِ کارواں میں نہیں خوئے دلنوازی

زبانِ بے زبانی'

اقتدار احمد

دل کی زبان اور روح کی ترجمان ہوتی ہے

ہائے' ترکی کا مسلمان نوجوان روحانیت کے لئے کیسے ترستا ہے!

ترکی کے سفرنامے کی پہلی قسط گزشتہ شمارے میں دہرادی گئی تھی تاکہ اس سلسلۂ مضامین کا ایک سرا تو نئے پڑھنے والوں کے ہاتھ آجائے۔ پچھلی دفعہ تعارف میں غلط لکھا گیا کہ پانچ قسطیں دو سال پہلے شائع ہو چکی تھیں' دراصل اس کی سات اقساط آچکی ہیں اور کسی نے ٹوٹا ہوا سلسلہ جوڑنا ہی ہو تو ۱۱/ جنوری ۱۹۹۳ء کا شمارہ دیکھے جہاں سے بات اب آگے بڑھ رہی ہے ——————— مدیر

ہفتہ یکم اگست (۱۹۹۲ء) کے اُس دن کی مصروفیات نے مجھے تھکا ہی نہیں دیا' جذباتی ہیجان کے بھی کئی شدید جھٹکوں سے دوچار کیا تھا۔ قصرِ توپ کاپی کی سیر جس کی ایک ایک اینٹ نے سرگوشیوں میں دلگداز کہانیاں سنائیں اور جس کی ایک ایک محراب دنیا کی بے ثباتی کے نقشے پر کوئی نہ کوئی نیا زاویہ بناتی ہے' ان متبرک نوادرات کی زیارت جو پہلی ہی نظر میں اصلی لگتے اور مجھ جیسے گلابی وہابی کے دل کی دنیا کو بھی تہہ و بالا کر کے رکھ دیتے ہیں' سلاطین و خلفائے عثمانی کے خزانوں سے برآمد ہو کر سامانِ عبرت بن جانے والے زر و جواہر کے انبار جو ان کے کسی کام نہ آئے' میزبانِ رسولؐ حضرت ابو ایوب انصاری کی قبرِ مبارک پر فاتحہ خوانی اور اس ذوق و شوق کا تصور جس نے مدینہ میں گور کنارے موت کے انتظار میں بیٹھے ایک بڈھے پھونس (رضی اللہ عنہ) کو اٹھا کر اس پہلے لشکر کے ہراول دستے میں شامل ہونے پر مجبور کر دیا جسے نبی اکرم ﷺ کی طرف سے جنت کی بشارت تھی اور آخر میں وہ بدمزگی جس سے "حلقۂ ذکر" میں دوچار ہوا۔

ہم نے حلقۂ ذکر سے واپس آکر مرمرہ ہوٹل میں اپنے کمرے کے گوشۂ عافیت میں پناہ لیتے ہی پہلے تو باجماعت عشاء کی نماز ادا کی اور پھر اللہ کا نام لے کر اپنے بستروں میں دراز ہو گئے۔ نہیں کہہ سکتا کہ برادر محترم ڈاکٹر اسرار احمد کیا سوچتے نیند کی آغوش میں گئے ہوں گے' اپنے اندر تو خیالات کے طوفان اُمڈ رہے تھے۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضلِ خاص سے قرآنی بصیرت سے نوازا ہے۔ اس حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے میں ذرا بھی مبالغہ آرائی نہیں کر رہا کہ کتابِ ہدائت سے اپنی قلبی مناسبت اور زندگی کے شب و روز اس کے ساتھ گزارنے کے باعث اب وہ قرآن کی زبان میں سوچنے پر قادر ہیں جیسے ہم انگریزی زبان میں خطابت کے جوہر دکھانے والے اپنے کسی دیسی بھائی کو کریڈٹ یہ دیا کرتے ہیں کہ وہ تو سوچتا بھی انگریزی میں ہو گا۔ وہ اگر میری طرح بے چین ہوتے تو اتنی جلدی ان کے خراٹے سنائی نہ دیتے۔ میری نیند کو ان کے خراٹوں کی آواز کے علاوہ اضطراب کی لہریں جھاگ کی طرح اُڑا رہی تھیں۔ مجھ سا کم علم اور بے عمل آدمی جس کا کُل "فکری سرمایہ" آنکھوں کی نمناکی' دل کی نرمی اور دماغ کی اثر پزیری ہو' ان سوالات کا جواب کہاں سے نکال کر لاتا جو یکے بعد دیگرے سر اٹھاتے اور ایک جھلک دکھا کر کوئی حتمی جواب پائے بغیر پھر دبک جاتے۔ مشکل میرے ساتھ یہ بھی ہے کہ جسمانی تکان نیند کو آواز نہیں دیتی' بھگا دیتی ہے۔ "اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی"۔

اچانک یاد آیا اور غنودگی سے زیادہ مسکنِ اعصاب دوا کے بوجھ سے بعد از خرابیٔ بسیار بند ہونے پر آتی آنکھوں کو اس خیال نے پٹ سے کھول کر رکھ دیا کہ نیچے کنونشن ہال میں تو اس وقت ایک بہت اہم پروگرام جاری ہے۔ زغرب سے بطورِ خاص تشریف لانے والے ڈاکٹر عزت اگانووچ بوسنیا ہرزیگووینا کے مسلمانوں کے حالاتِ زار بیان کرنے والے تھے اور ان کے پروگرام میں ویڈیو فلم اور سلائیڈوں کی نمائش بھی شامل تھی۔ اس کے بعد امریکی ڈاکٹروں نے نئی صلیبی جنگ کا نقطۂ آغاز بننے والی جور و ستم اور قتل و غارت گری کی اس گرم بازاری کے تازہ تازہ شکار یورپی مسلمان بھائیوں کے لئے چندہ بھی جمع کرنا ہے جنہیں عالم اسلام نے بھیڑیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ میں اپنے بستر سے نکلا' روشنی کے بغیر کمرے کی چابی کو ٹٹول کر قبضے میں کیا اور دبے پاؤں راہداری میں نکل آیا۔ غنیمت ہے کہ دروازہ کھولنے اور بند کرنے کے عمل کو بھی بے آواز رکھنے میں کامیاب ہو گیا اور اس اطمینان کے ساتھ کنونشن کی پچھلی نشستوں میں سے ایک پر آبیٹھا کہ ڈاکٹر صاحب کی نیند میں خلل واقع نہیں ہوا ہے۔ وہ اتنی گہری نیند سوئے ہوئے ہیں کہ میری "غیوبتِ صغریٰ" ان کے علم میں آئے گی نہ کسی تشویش کا باعث ہو گی۔

ڈاکٹر عزت اگانووچ نے جو تفصیلات بتائیں' وہ لرزا دینے والی تھیں۔ اب ان کا ذکر کرنا یوں بھی ضروری نہیں رہا کہ عالمی ذرائع ابلاغ نے سمعی و بصری تشہیر کر کے ان کی اثر آفرینی کی دھار کو کند کر ہی دیا۔ راجہ داہر کے قید خانے سے ایک مسلمان خاتون کی چیخ اموی خلیفہ کے گورنر حجاج بن یوسف نے اپنے دارالامارۃ میں بیٹھے سن لی تھی' ہمارے درجنوں مسلمان حکمران وحشت و بربریت کا رقص آنکھوں دیکھ کر بھی ٹس سے مس نہ ہوئے تو اس لئے کہ "میڈیا" نے ہماری غیرت و حمیت کو "انفریشن" کی "ویکسین" دے کر "حِس پروف" کر دیا ہے۔ یہ "بیماریٔ دل" اب وبا کی طرح پھیل تو سکتی ہی نہیں' اکا دکا فرد و بشر کو ہو بھی جائے تو اس کی چھوت نہیں لگتی اور پوری طرح قابلِ علاج بنا دی گئی ہے۔ ویڈیو اور سلائیڈوں کا دور میری آمد سے پہلے چل چکا تھا اور میں نے اس پر شکر ہی کیا کہ یہ "تفریح" مجھے میسر نہ آئی تھی۔ ڈاکٹر عزت کی باوقار و پُرعزم گفتگو اور پھر برطانیہ کے باسی پاکستانی ڈاکٹر صاحب کی اپیل کے بعد جو

مجھے اچھی نہ لگی' حیدر آباد دکن سے تعلق رکھنے والے ایک امریکی ڈاکٹر نے مائیک سنبھال لیا۔ برطانوی پاکستانی ڈاکٹر نے بھیک مانگنے کا سا انداز اختیار کیا تھا جو نہ ان پر سجا اور نہ بالفعل موجود ماحول میں اس کی کوئی ضرورت تھی۔ وہ بیزاری پھر تازہ ہوگئی جو انہی صاحب کی ڈاکٹر اگانووچ کی معیت میں برادر محترم سے ملاقات کے لئے ہمارے کمرے میں آمد نے میرے دل میں پیدا کی تھی۔ مجھے تو یوں لگا تھا جیسے ان حضرت کو اس "سفارت" کی فتوحات میں سے کوئی متعین حصہ ملنا طے ہو۔ یقیناً ایسا نہیں ہوگا تاہم حسن تو طلب میں بھی پیدا کیا ہی جا سکتا ہے جو ان کے بعد آنے والے امریکی ڈاکٹر نے بڑی "فنکاری" بلکہ چابکدستی سے پیدا کر کے دکھا بھی دیا۔

حیدر آبادی ثم امریکی ڈاکٹر بلا کے "سیلز مین" نکلے۔ ڈاکٹری اور نیلامی کے پیشوں میں کوئی تعلق ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا لیکن کیا عجب ان کا خاندانی پس منظر دکانداری کا ہو۔ وہ اس مشاقی سے گویا ایک کامیاب نیلام کنندہ کا کردار ادا کر رہے تھے جیسے اس فن کی خصوصی تربیت حاصل کر رکھی ہو۔ ان کی چرب زبانی قابل دید وشنید تھی۔ "تیری زباں کے آگے نہ دہقاں کا ہل چلے"۔ انہوں نے آن کی آن میں ماحول کی سوگواری کو ہوا میں تحلیل کر کے رکھ دیا اور اپنی مہارت کے مظاہرے میں کمال کر دکھایا۔ "وہ جو خاتون کھڑی ہوگئی ہیں' شاید اپنے کانوں کے بندے پیش کرنا چاہ رہی ہیں ---- آیئے' آگے تشریف لے آیئے۔ جی! سبحان اللہ اس میں تو ایک قیمتی جڑاؤ پتھر بھی ہے۔ اللہ آپ کے ایثار کو قبول کرے' جایئے تشریف رکھئے ---- اور ہاں اب میں اسے خریداری کے لئے پیش کرتا ہوں' ظاہر ہے کہ سب سے اونچی بولی ان کے شوہر نامدار ہی دیں گے۔ لیجئے وہ کھڑے ہو گئے اور مسکراتے ہوئے خراماں خراماں تشریف لا رہے ہیں۔ تو ڈاکٹر صاحب' کانوں کے یہ آویزے آپ اپنی چہیتی بیگم کو پھر سے تحفہ میں دیں گے نا---- اور تحفہ کی بھی بھلا کوئی قیمت ہوتی ہے؟---- کیا فرمایا' دو ہزار ڈالر ---- ابھی اتنے میں تو ان کی ایک مسکراہٹ بھی سستی ہے۔ دس ہزار نکالئے' انہیں بھی تو پتہ چلے آپ انہیں کتنا چاہتے ہیں ---- اور خواتین و حضرات' ڈاکٹر صاحب نے تو پندرہ ہزار ڈالر پیش کر دیئے ہیں۔ محبت ہو تو ایسی' جزاک اللہ خیر ---" یوں انہوں نے کتنی ہی انگوٹھیوں' طلائی چوڑیوں اور کانوں کے ہمہ قسم کے زیورات کے بلیک کے بھاؤ دام کھرے کئے اور محفل کا رنگ بھی بدل دیا۔ کہاں غم و اندوہ اور کرب و اذیت کے وہ احساسات جو ویڈیو کے مناظر اور ڈاکٹر عزت اگانووچ کے بیان نے پیدا کئے تھے اور کہاں یہ ورائٹی شو کا سا سماں جس نے تفریح اور کھیل تماشے کی شکل اختیار کر لی۔ پھر "فنڈ ریزنگ" یعنی چندہ جمع کرنے کے روایتی طریقے سے کام نکالا جانے لگا جس کے لئے انہوں نے وہیں کھڑے کھڑے برصغیر کی دم توڑتی تہذیب اور امریکی پھکڑبازی کا ایک آمیزہ تیار کیا تھا۔ چیک جمع کئے گئے اور وعدوں کا اعلان بھی ہوا۔ جمع ہونے والی رقم کا میزان وہ ساتھ ساتھ کرتے جاتے تھے۔ یہ عدد جب ان کے اعلان کے مطابق دو لاکھ ڈالر کو پہنچنے لگا تو میں اٹھ آیا کہ صبح کی نماز کا فکر دامن گیر تھا ورنہ یہ سلسلہ وہاں نجانے کتنی دیر اور چلا ہوگا۔ اپنے کمرے کے تالے میں چابی گھماتے اور دروازے کو کھول کر بستر میں گھستے میں نے پوری احتیاط کی کہ ڈاکٹر صاحب کے آرام میں مخل نہ ہو جاؤں اور خیال ہے کہ اس میں مجھے کامیابی بھی ہوئی۔

صبح کی نماز میں نصف شب تک چلنے والی اس تقریب کا اثر محسوس بھی ہوا۔ ڈاکٹر عزت اگانووچ اور ان کے برطانوی ساتھی غائب تھے اور ان خواتین و حضرات کی بڑی تعداد بھی جو گزشتہ شب جانِ محفل بنے رہے۔ البتہ جناب ابراہیم یزدی نے اپنا معمول برقرار رکھا اور بعد از نماز برادر محترم کی مختصر تقریر میں انہماک بھی ان کا پہلا جیسا ہی رہا۔ سورۃ الحجرات کے آخری حصے پر جاری گفتگو کا سلسلہ اسلام و ایمان کے فرق کو واضح کرنے کے بعد اب جہاد کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا جو قرآن مجید کی صراحت کے مطابق "ایمان" کا رکنِ رکین ہے اور جو نفسِ امارہ کے پہلوان سے پنجہ آزمائی کے بعد درجہ بدرجہ سیڑھیاں چڑھتا غلبۂ دینِ حق کی اعلیٰ ترین منزل تک پہنچتے "قتال فی سبیل اللہ" میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ظرف میں جو کچھ بھی ہو' چھلکتا تو وہی ہے چنانچہ "بات پہنچی تری جوانی تک" چنانچہ اسی کو ڈاکٹر صاحب نے اسلامی انقلاب کا آخری مرحلہ قرار دیا۔ اسلام و ایمان کی بحث بھی ڈاکٹر یزدی کی خاص دلچسپی کا موضوع ثابت ہوئی تھی اور اپنے رنگ کے ایک اسلامی انقلاب کی منزل کو تو وہ سر کر کے آئے تھے جس سے روشنی مہیا کرنے پر برادر محترم جناب خمینی کا احسان علی الاعلان مانتے ہیں کہ عملی رہنمائی ان کے انقلاب سے یہ ملی کہ عصرِ حاضر میں یہ جہاد "وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا" نہیں' محض "وَقُتِلُوا" ہوگا کیونکہ ریاستی مسلح افواج کا مقابلہ کوئی بھی انقلابی تحریک نہتے عوام کی قوت کے بل پر اب کر ہی نہیں سکتی۔ قبل ازیں اپنے اسلامی انقلاب کے نتائج سے مایوس یہ ایرانی دانشور اسلامی انقلاب کے مراحل پر جتنی کچھ بھی گفتگوئیں برادر محترم سے کر چکے تھے' ان سب میں اپنی خاموش شرکت کی وجہ سے مجھے معلوم ہے کہ ڈاکٹر یزدی کو تسلیم کرنا پڑا تھا کہ انقلاب کے مراحل کی کوئی نہ کوئی کڑی ایران میں غائب ضرور رہی تھی اور حسبِ توقع نتائج اگر نہیں نکلے تو اس کا سبب بھی یہی ہو سکتا ہے۔

نماز کے بعد اپنے کمرے میں آ کر ہم نے فیصلہ کیا کہ آئی ایم اے کے مقامی سیاحتی ایجنٹ یعنی "وی آئی پی" کے مرتب کئے ہوئے پروگرام کو نظرانداز کر کے آج ہم اپنی آزاد مرضی سے شہر میں گھومیں پھریں گے جس کے لئے میں نے عزے سے ایک روز پہلے ہی ساز باز کر لی تھی۔ عزے آپ کو یاد ہے' وہی غریب ترک نوجوان جو جدید عربی زبان و ادب کا طالب علم ہے اور مجھے سرراہ مل گیا تھا۔ وہ دس بجے کے لگ بھگ پہنچنے والا تھا جسے میں نے محض احتیاطاً ہی بلا لیا تھا کہ اگر اسے ساتھ لے کر کہیں آنے جانے کا پروگرام نہ بنا تو کچھ دیر گپ شپ ہی رہے گی۔ عزے کے اس پُرخلوص اصرار پر کہ مجھے کسی خدمت کا تو موقع دیجئے' اسے بلانا ہی پڑا تھا۔ ابراہیم ریلی کی طرف سے بھی یہ پیشکش دائم و مفتوح تھی' وہ بھی میری باتوں سے یکساں متاثر ہوا تھا اور گھر لے جا کر مجھے اپنے بچوں تک سے ملوانے کا خواہشمند تھا لیکن اس کی طرف سے میں نسبتاً محتاط رہا۔ آخر تو وہ ٹورازم کا ایک لائسنس یافتہ "گائیڈ" تھا۔ کچھ طلب نہ کرتا تب بھی اسے معاوضہ دینا مجھ پر واجب تو ہوتا جس کی شرح کا کم از کم مجھے کوئی اندازہ نہیں۔ ویسے بھی میں دیکھ رہا تھا کہ وہ ان دنوں خاصا مصروف ہے۔ "وی آئی پی" کمپنی امریکی ڈاکٹروں اور ان کے اہل و عیال پر مشتمل جو چھوٹے بڑے گروپ مقامی سیاحت کے منتخب و مطلوب پروگراموں کے لئے ہر آن بناتی رہتی' ان کو ساتھ لے جانے کی غرض سے گائیڈوں کی ڈھنڈیا پڑی رہتی اور ابراہیم ریلی سمیت سب "رہبر" لمبے ہاتھ مار رہے تھے۔ میں نے سوچا تھا کہ عزے کو ہم جو بھی پیش کر دیں گے اسے وہ تو بڑے پس و پیش کے بعد قبول کرے گا لیکن ہمیں خوشی ہوگی کہ ایک غریب طالب علم کی تھوڑی بہت مدد ہو گئی۔

"وی آئی پی" کے پہلے سے طے شدہ عمومی

پروگرام میں آج قصرِ ڈولماباشی کی سیر کے علاوہ ترکی کے اسلامی آرٹ کے عجائب گھر کا چکر شامل تھا جس کے بعد چوک سلطان احمد میں روشنی اور موسیقی کا ایک ایسا شو بھی ہونا تھا جس پر ہر اتوار کو سیاحوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جایا کرتے ہیں۔ ڈولماباشی کے تو نام سے ہی مجھے وحشت ہونے لگی تھی جس کی بنیادوں میں ناعاقبت اندیش حکمرانوں نے اپنی عظمتِ رفتہ کو دفن کر کے خلافتِ عثمانیہ کے زوال کی داغ بیل ڈالی۔ اس کی آرائش و زیبائش اور سامانِ عیش و طرب عام سیاحوں کے لئے دلچسپی کا باعث ہوگا' میرے لئے عبرت کا تازیانہ ---- اور یہ تازیانے مجھے مسلسل برداشت کرنے پڑ تو رہے تھے 'اپنی ننگی پیٹھ خود سے کیوں پیش کرتا!۔ اسلامی آرٹ ہر طرف بکھرا پڑا ہے' اسے شوکیسوں میں مقید دیکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے اور رنگ و آہنگ مجھ ایسے قنوطیوں میں عارضی و مصنوعی انشراح و انبساط بھی پیدا نہیں کرپاتا۔ اسراف و تبذیر

ڈھانچہ" کے موضوع پر کنونشن کے اختتامی اجلاس میں ان کے خطاب کا خاکہ تھا۔ وہاں انہیں مہمانِ خصوصی کے طور پر کلیدی تقریر (Keynote Speech) کرنا تھی۔ میں غسلخانے میں جاگھسا۔ ڈاکٹر صاحب اپنے ہر خطاب بلکہ درس قرآن کے لئے بھی یہ اشاریہ پہلے سے مرتب کرتے ہیں اور حسبِ موقع عام پیڈ سائز کے ایک' دو بلکہ تین تک صفحات میں پھیلے ہوئے یہ نوٹ پڑھنے کے علاوہ دیکھنے کی بھی چیز ہوتے ہیں۔ صاف ستھرے خوش خط لکھے ہوئے الفاظ' جملے' آیات قرآنی و احادیث شریفہ کے صرف حوالے اور کہیں کہیں ابتدائی چند الفاظ بھی' اشعار اور مصرعوں کی علامتیں بلکہ چارٹ نما خطوط و دوائر بھی مختلف رنگوں کے جلی و خفی مارکروں کے ذریعے نمایاں اور ایک دوسرے سے ممیز کئے ہوتے ہیں۔ پھر جہاں کسی بات پر خاص زور دینا ہو' اس کی جانب انسانی مٹھی سے نکلتی ایک انگلی

ٹوٹی پھوٹی عربی سے کام لے کر اس نے مجھے دراصل زبانِ بے زبانی سے دیا تھا۔ زبانِ بے زبانی کا آپ کو تجربہ ہے؟ --- یہ قلب کی زبان ہے' روح کی ترجمان ہے' دل کا مان ہے۔ صرف و نحو کے قواعد کی پابند ہے نہ کسی گرامر کی محتاج۔ از دل خیزد بر دل ریزد--- عزے کا تو لکھی پڑھی جانے والی اپنی جدید عربی پر تکیہ تھا اور میں بول چال کی عربی میں دو چار جملے ادا کر لینے کی اپنی استعداد پر بھروسہ کرتا رہا لیکن دونوں کو گزشتہ پہلی ہی ملاقات میں اندازہ ہو چکا تھا کہ دورانِ گفتگو اشاروں کو الفاظ سے تو تھوڑی بہت مدد مل سکتی تھی' جملوں سے نہیں کیونکہ دونوں ہی بقول کسے مشق کے معاملے میں پیدل نکلے۔ مجھے عرب ممالک میں وقت گزارے بہت عرصہ ہو گیا ہے اور وہ تو تھا ہی ہنوز ایک مبتدی طالب علم--- ترکی سے میں نابلد' اردو انگریزی سے وہ بے بہرہ۔ میں اسے ساتھ لے کر اپنے کمرے میں چلا آیا تاکہ برادر محترم سے ملاقات کرا

لوگو' ہمیں وہ روشنی دو جو دل کی دنیا کو مُنوّر کردے' وہ نغمہ سناؤ جو روح کے تار چھیڑ دے

کے یہ مظاہرے بے فکروں کے لئے ہیں' تمہارے پاس وہ روشنی ہو جو دل کی دنیا کو منور کردے اور وہ نغمہ ہو جو روح کے تار ہلا دے تو لوگو' ہمارے لئے اس کا کوئی انتظام کرو!۔

ہم نے ناشتے کا وقت شروع ہوتے ہی ہوٹل کے اسی ریستوران کا رخ کیا جو آئی ایم اے کے مہمانوں کے "بریک فاسٹ" کے لئے مخصوص تھا۔ حسبِ معمول "بوفے" میں انواع و اقسام کے درجنوں مشروبات و ماکولات سجے ہوئے تھے۔ انتخاب کے اتنے وسیع امکانات اور مقدار کی وہ فراوانی کہ کھانے والے حلق تک پیٹ میں ٹھونس لیں اور جی بھی بھر جائے لیکن طویل میزوں پر سجے خوراک کے ذخیرے میں کمی اور "سپلائی" کے نہ ٹوٹنے والے تار میں تعطل نہ آنے پائے۔ ہم نے اللہ کی ان نعمتوں سے آج بھی خوب تمتع کیا بلکہ شعوری طور پر اسے "برنچ" یعنی بریک فاسٹ اور لنچ کا قائمقام بنانے کی کوشش کی تاکہ دن میں گھومتے پھرتے تھوڑی بہت آوارہ خوری سے ہی گزارا ہو جائے۔

اپنے کمرے میں واپس آکر برادر محترم تو اپنے اس اشاریے (Notes) کی نوک پلک سنوارنے میں مصروف ہو گئے جو "دورِ حاضر میں نظامِ خلافت کا سیاسی

(بلکہ انگشتِ شہادت) اشارہ کر رہی ہوتی ہے۔ (خبردار! ڈاکٹر صاحب کی بنائی ہوئی یہ "تصویر" محض ایک خاکہ ہوتی ہے)۔ یہ اشاریہ چونکہ انگریزی میں تھا کہ اسی زبان کو ذریعۂ اظہار بنانا طے تھا لہٰذا زیادہ جلی اور اہم تر الفاظ بڑے یعنی Capital حروف میں تھے۔ سننے والوں کو برادر محترم کے بیان میں جو خوبیاں نظر آتی ہیں' ترتیب' ربط' روانی' منطق' برمحل حوالے' جملوں کی نشست و برخواست اور ہر بات کو پورا کر کے آگے بڑھنا وغیرہ' اور سب سے بڑھ کر وہ اعتماد' بولتے ہوئے جس سے وہ بھرپور کام لیتے ہیں' یہ محاسن یونہی تو پیدا نہیں ہو جاتے۔ ان کے لئے انہوں نے جان ماری ہے' اپنا خونِ دل جلایا ہے اور اب تک بھی وہ اس محنت سے جی نہیں چراتے --- "نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر"۔

اپنے معمولات سے فارغ ہوتے ہی تیار ہو کر میں نیچے لاؤنج میں آبیٹھا تاکہ عزے کو ہمارے کمرے تک پہنچنے میں دشواری بلکہ اس سے بھی زیادہ جھجک نہ ہو۔ وہ بے چارہ ساڑھے نو بجے ہی آپہنچا۔ "میں نے سوچا کہ راستے میں کہیں دیر لگ گئی تو آپ کو انتظار کی زحمت اٹھانی پڑے گی لیکن آج تو مجھے شوق کے پر لگے ہوئے تھے' معمول سے بھی کم وقت لگا"۔ یہ تاثر

دوں اور پھر اس کی مدد سے ہم سیر کا کوئی پروگرام بنائیں۔

میرے جیسی ایک اور' لیکن ہر اعتبار سے کہیں زیادہ بھاری بھرکم شخصیت سے مل کر عزے کے دل میں ہم پاکستانی مسلمانوں کے لئے عزت و احترام سہ چند ہو گیا۔ اس کا بس نہ چلا بلکہ یوں کہئے کہ وہ خائف تھا ورنہ شاید میرے بھائی کے ہاتھ کو چومنا چاٹنا شروع کر دیتا۔ ہائے' ترکی کا عام مسلمان نوجوان روحانیت کو کیسے ترستا ہے!۔ میں نے دو طرفہ تعارف تو کرا دیا' اب اس امید میں تھا کہ برادر محترم فصیح عربی میں عزے سے بات کریں گے تو میری "کلو کیبل" عربی کو بھی اپنے "جوہر" دکھانے کا موقع مل جائے گا لیکن حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے کیونکہ موسمِ گل ہماری گفتگو کے صحن میں اترا ہی نہیں۔

ادھر ڈاکٹر صاحب کو بھی بولنے کی مشق نہیں اور وہ لب و لہجہ تو ظاہر ہے کہ میسر آ ہی کیسے سکتا ہے جو عزے اپنے مصری' شامی اور فلسطینی اساتذہ کی زبان سے سننے کا عادی تھا اور ادھر عزے قرآنی عربی سن کر ویسے ہی گڑبڑا گیا' غریب کی گھگی بندھ گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا ---- "ٹھیک ہے' شریف آدمی لگتا

(باقی صفحہ ۳۵ پر)

بقیہ : پریس ریلیز

بالکل ہی افراتفری کا شکار ہو جائے گا۔ مراعات یافتہ طبقات کی مراعات میں اضافہ ہو گا اور محروم طبقات کی تلخیاں بھی اسی شرح سے بڑھ جائیں گی جبکہ طبقاتی کشمکش وہ بھیانک شکل اختیار کر لے گی جس کا آج ہم اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ مہنگائی لوگوں کو بالکل ہی ڈبو کر رکھ دے گی جس میں ان کا ناطقہ پہلے ہی بند کر رکھا ہے اور ان سب خرابیوں کا نتیجہ بدامنی اور لوٹ مار کی انتہا میں ظاہر ہو گا جس کی حالت ہمارے ہاں آج بھی قابل اطمینان نہیں۔ بجلی کی گرانی ہمہ گیر مہنگائی کو جنم دے گی جس کے نتیجے میں افراط زر بڑھے گا اور اس کے ساتھ بے روزگاری کا عفریت بھی آئے گا۔

امیر تنظیم اسلامی نے کہا کہ پورا عالم عرب' براعظم افریقہ اور مشرق بعید کا بڑا حصہ نیو ورلڈ آرڈر کے تحت اس صیہونی منصوبے کی گرفت میں آ چکا ہے۔ کہیں کہیں تھوڑی بہت مزاحمت باقی ہے جسے دم توڑنے میں زیادہ دیر نہ لگے گی۔ چین لوہے کا ایک چنا ہے جس کے لئے دانت تیز کئے جا رہے ہیں' ایران کے گرد گھیرا تنگ کیا جا رہا ہے اور سب سے منفرد معاملہ پاکستان کا ہے جو نہ صرف دنیا کی واحد نظریاتی ریاست ہے اور ایک طاقت ور نظریہ زندگی رکھتی ہے بلکہ اس کے ایٹمی دانت بھی نکل آئے ہیں۔ اس پر تین پہلوؤں سے بھرپور حملے کا آغاز ہو چکا ہے۔ نجکاری اور بیرونی سرمائے کے لئے اپنی معیشت کے دروازے کھول دینے کا کام نواز شریف سے لیا گیا تھا اور اب اسی عمل کو ملٹی نیشنل کارپوریشنوں کے ذریعے مطلوبہ ہدف تک پہنچایا جا رہا ہے۔ دوسرے محاذ پر سیکولرزم کی یلغار دین و مذہب کو اس ملک خداداد سے دیس نکالا دے رہی ہے جو اسلام کے نام پر عالم وجود میں آیا تھا۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ اس حملے کا تیسرا محاذ پاکستان میں بسنے والی مسلمان قوم کا اخلاق و کردار ہے جس پر ہمارے دشمنوں نے زبردست دباؤ ڈال رکھا ہے۔ مشرق کے خاندانی نظام کو توڑ پھوڑ کر رکھ دینے اور شرم و حیا کا جنازہ نکال ینے کے لئے فحاشی و عریانی اور مغربی تہذیب کا سیلاب یا جا رہا ہے اور قاہرہ کانفرنس بھی اسی سلسلے کی ایک ڑی تھی جس میں ایک نام کی مسلمان خاتون کی براہی میں قائم یو این او کے ادارے کو استعمال کیا گیا مسلمانوں ہی کے ایک تہذیبی مرکز میں پاکستان ی نظریاتی ریاست کی مسلمان خاتون وزیر اعظم کی شرکت کے ذریعے خاندانی منصوبہ بندی کی ناپاک مہم کو مثالی تقویت پہنچائی گئی تاکہ ہم اخلاق و کردار کی رہی سہی پونجی سے بھی محروم ہو جائیں۔ آخر میں امیر تنظیم اسلامی نے اعلان کیا کہ ملک و قوم جس نازک صورت حال سے دوچار ہے اس میں ہمارے لئے واحد چارۂ کار اپنے نظریے کی طرف لوٹنا اور نظام خلافت کا قیام ہے جس کے لئے خالص انقلابی جدوجہد کی ضرورت ہو گی۔ انہوں نے حاضرین کو دعوت دی کہ اگلے جمعہ کی شب موچی دروازے میں منعقد ہونے والے ان کے جلسۂ خلافت میں اپنے دوستوں کو ساتھ لے کر شامل ہوں تاکہ اس حل کی تفصیلات کو سامنے لایا جائے جو ہمارے ملی امراض کا واحد علاج ہے۔OO

بقیہ : ایڈیٹر کے ڈیسک سے

پوشیدہ حکمت کا اندازہ بھی ہو ہی گیا ہے کہ میری قلم سے وہ فریاد نکلی جس نے ساتھیوں میں سے اکثر کی توجہ اس اہم پہلو کی طرف مبذول کرا دی ورنہ سوچ سمجھ کر کون اپنے آپ کو "چاند ماری" کے لئے پیش کرتا ہے؟۔ یہ روائت اب آگے بڑھنی چاہئے۔ صرف میں نہیں' یہ سبھی راہرو میر کارواں کی' ان کے معاونین کی اور اپنے ہمسفروں کی تائید و نصرت اور حوصلہ افزائی کے محتاج ہیں۔

اب آخر میں "ندائے خلافت" کے محترم قارئین سے دو ضروری گزارشات۔ مہربانو' تائید و تحسین کے ساتھ آپ کی طرف سے تنقید و تبصرہ بھی موصول ہونا چاہئے۔ دونوں کی ہمیں یکساں ضرورت ہے اور ظاہر ہے کہ دونوں طرح کے یہ مرغوب خاطر اور بار خاطر کام کرنے کے لئے آپ کو ہم سے رابطہ تو رکھنا ہی پڑے گا۔ فہو المطلوب' کوئی انجمن ستائش باہمی بنانا مقصود نہیں ہے!۔ آپ اپنے جرائد سے کٹے چلے جا رہے تھے۔ اس سے ذہنی بُعد پیدا ہوتا ہے جو انجام کار خود تحریک سے بھی فاصلہ بڑھانے پر منتج ہوتا ہے۔ ایک بہانے سے یہ برف ذرا پگھلی ہے تو ربط باہم کی دھوپ سے آئندہ محروم نہ ہونے پائے۔ اس سے بھی بڑھ کر ضرورت اس بات کی ہے کہ "ندائے خلافت" کی اشاعت بڑھانے کی حتی المقدور کوشش کی جائے۔ یہ پرچہ سٹالوں سے بکنے والا نہیں' اسے تو آپ ذاتی اثر و رسوخ کو استعمال میں لا کر اپنے حلقۂ احباب میں ہی کھپا سکتے ہیں۔ اور اس میں کون سی بڑی دشواری ہے؟۔ ذرا حساب تو لگائیے' محض اخبار بینی پر لوگ ماہانہ کیا خرچہ کرتے ہیں؟۔OO

بقیہ : دورۂ کوئٹہ

خطاب کے اعلان کو خبر کی صورت میں شائع کیا۔ اس موقع پر وکلاء کی بہت بڑی تعداد موجود تھی۔ آپ کے بار کونسل میں خطاب کا موضوع "استحکام پاکستان" تھا۔ آپ نے اس موضوع پر کھل کر گفتگو کی۔ خطاب کے بعد آپ نے وکلاء کے سوالات کے تسلی بخش جواب بھی دیئے۔

۵ اکتوبر بروز بدھ امیر محترم نے صبح کے اوقات میں تنظیم اسلامی کے رفقاء کے اجتماع میں شرکت کی اور خطاب فرمایا۔ اس موقع پر بعض تنظیمی و دعوتی نوعیت کے امور زیر بحث آئے۔ یہ امیر محترم کا کوئٹہ میں آخری پروگرام تھا۔ اسی روز آپ واپس لاہور تشریف لے آئے۔ ان تمام پروگراموں کو کامیاب بنانے میں کوئٹہ کے رفقاء نے بہت زیادہ محنت کی' نیز ناظم حلقہ سندھ و بلوچستان سید نسیم الدین نے بھی بہت جان ماری اور تمام پروگراموں کو کامیاب بنایا۔ اللہ تعالیٰ تمام رفقاء کی محنتوں کو شرف قبول عطا فرمائے' آمین۔OO

بقیہ : زندگانی کی گزرگاہوں میں

ہے۔ بھلے آدمی سے ہمیں کچھ تو مدد مل ہی جائے گی" اور میں نے سوچا کہ ہم جو بات اسے منٹوں میں سمجھائیں گے' اس کا جواب کسی ترک سے تو ہمیں سیکنڈوں میں لے ہی دے گا۔ بورڈوں پر لکھی عبارات کا مطلب ایک حد تک تو سمجھا دے گا۔ مقامات کے نام تو بتا دے گا۔

اب ہم تینوں اکٹھے ہوٹل سے برامد ہوئے اور فیصلہ کیا کہ سیر کا لطف اٹھانا ہے تو لوگوں میں گھل مل جانے کے لئے پبلک ٹرانسپورٹ استعمال کرنی ہو گی۔ پیلی ٹیکسی (وہاں ییلو کیب پہلے سے موجود ہے) کا مزا لے ہی چکے ہیں کیوں نہ بسوں ٹراموں کے جھولے بھی لئے جائیں جن کی طرف رخ کرنے کی اب اپنے ملک میں تو ضرورت کبھی پیش نہیں آتی۔ ہوٹل کے سامنے ہی دو رویہ سڑک عبور کر کے ہم ایک لوکل بس سٹاپ پر جا پہنچے اور عزمے کے ہاتھ میں لیروں کے کچھ نوٹ تھماتے ہوئے کہا --- "اگلی بس جہاں بھی جاتی ہو' وہیں کے ٹکٹ لے لینا' ہم اس کی منزل کا تعین کئے بغیر سوار ہو جائیں گے"OO --- (باقی باقی)

WEEKLY "NIDA-E-KHILAFAT" LAHORE
36-K, Model Town Lahore- 54700 Regd:No L. 9184

پریس ریلیز

یہ کرۂ ارضی پر اپنی مالیاتی حکومت قائم کرنے کے صیہونی منصوبے کا حصہ ہے

ڈالروں کی برسات جس سے پہلے بادل آئے نہ ٹھنڈی ہوا چلی : یہ چٹ منگنی پٹ بیاہ خود معمہ ہے

امیرِ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے اپنے خطابِ جمعہ میں ڈاکٹر مبشر حسن کی صاف گوئی کو خراجِ تحسین پیش کیا

لاہور - ۱۴/ اکتوبر: - امیر تنظیم اسلامی و داعیٔ تحریکِ خلافتِ پاکستان ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا ہے کہ برقی توانائی کے شعبہ میں بیرونی سرمایہ کاری کے سیلاب کا ریلا اگر محض ایک سیاسی سٹنٹ نہیں تو ایک بڑا مالیاتی سیکنڈل ضرور ہے اور نیو ورلڈ آرڈر کے تحت نئی عالمگیر مالیاتی حکومت کے صیہونی منصوبے کی طرف اس کے ایک اہم پیش رفت ہونے میں تو کوئی شبہ ہی نہیں۔ مسجد دارالسلام باغ جناح میں جمعہ کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ڈالروں کی بارش نے جس کے پہلے سے کوئی آثار نہ تھے لوگوں کو چونکا دیا اور اس چٹ منگنی پٹ بیاہ پر باخبر حلقوں کی طرف سے جو ردعمل سامنے آیا ہے اس میں سے ڈاکٹر مبشر حسن کا اعداد و شمار سے مزین بیان سب سے زیادہ اہم ہے۔ انہیں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ وہ اگرچہ اب پیپلز پارٹی میں موجود نہیں اور حکومت سے کوئی تعلق بھی نہیں رکھتے تاہم بے نظیر کے انکل تو ہیں اور یہ بات بہرحال سب جانتے اور مانتے ہیں کہ اپوزیشن یا نواز شریف صاحب کو ان کی عملی یا نظریاتی حمایت حاصل نہیں چنانچہ اس موقع پر قوم کو چشم کشا حقائق سے باخبر کر کے ڈاکٹر مبشر حسن نے ایک بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ امیرِ تنظیم اسلامی نے کہا کہ میں مالیات اور توانائی کے فنی پہلوؤں سے اس درجے واقف نہیں کہ کوئی تجزیہ کر سکوں چنانچہ ڈاکٹر مبشر حسن کے علم و تجربے پر اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے بتا رہا ہوں کہ ایسی کڑی شرائط پر بیرونی سرمایہ کاروں سے سودے بازی کی گئی ہے جن کے نتیجے میں نہ صرف صارفین کے لئے بجلی کا استعمال ایک عیاشی بن جائے گا بلکہ خود حکومت پاکستان ان مشتبہ سرمایہ کاروں کی غلط کاریوں کا خمیازہ بھگت کر اپنا دیوالہ نکال بیٹھے گی کیونکہ باہر سے آنے والا سرمایہ منصوبوں کی لاگت کا ایک ادنیٰ حصہ ہے جبکہ باقی رقم بینکوں سے جن ضمانتوں کے بل پر حاصل کی جائے گی ان سے پاکستان کسی بھی صورت بری نہیں ہو سکتا۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ ایک خاتون امریکی نائب سیکریٹری کی سربراہی میں مغرب سے آنے والے وفد نے جن منصوبوں کے معاہدے کئے ہیں ان کی اصل لاگت دو ہزار ایک سو ملین ڈالر سے زیادہ نہیں جبکہ انہیں ۳۵۰۰ ملین کا دکھایا گیا ہے یعنی ایک ارب چالیس کروڑ ڈالر کی رقم ان سرمایہ کاروں نے پہلے ہی جیب میں ڈال لی ہے جن کی اپنی سرمایہ کاری ستر کروڑ ڈالر سے زیادہ نہیں۔ پھر ان لوگوں میں کوئی بھی معروف امریکی کاروباری شخصیت یا ادارہ شامل نہیں تھا کیونکہ ان کی اکثریت گمنام اور اپنے بینکوں کے نادہندگان پر مشتمل ہے۔ مشرق کی جانب یعنی ہانگ کانگ سے اُمڈ کر آنے والے ڈالروں کے بادلوں کا قصہ بھی مختلف نہیں جس کا حجم حسبِ اعلان آٹھ ارب ڈالر کا تو ہے ہی نہیں، بہت سے بہت چھ ارب ڈالر کا بنتا ہے۔ یہ منصوبہ کوئلے کے استعمال سے تھرمل پاور بنانے کے آٹھ دس منصوبوں کا مجموعہ ہے جن کی تکمیل اگر ہوئی تو دس سال میں ہوگی اور اس دوران میں کوئلہ سندھ میں تھر سے نہیں نکالا جائے گا بلکہ باہر سے درآمد ہوگا کیونکہ مقامی کوئلے کی کانکنی کو مطلوبہ معیار و مقدار تک لانے میں برسوں لگیں گے۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ وجدانی طور میں یہ سمجھتا ہوں کہ توانائی کے یہ منصوبے دراصل ہمارے ایٹمی پروگرام کو رول بیک کرنے کا بہانہ ہیں۔ ہمارا ہمیشہ سے مؤقف یہ رہا ہے کہ ہم توانائی کے بحران کا شکار ہیں اور ہمارے ایٹمی پروگرام کا اصل مقصد اس بحران سے اپنی قوم کو نجات دلانا ہے۔ آج ہمارے ایٹم بم کا معاملہ تو اللہ ہی جانے خاموش سفارتکاری کے کس مرحلے میں ہے تاہم برقی توانائی کے متبادل انتظامات کا سماں باندھ کر ہمارے اس موقف کو کمزور کر دیا گیا ہے اور اب امریکہ کے لئے ہمیں صاف الفاظ میں کہنا ممکن ہو گا کہ ہمیں اپنے جوہری پروگرام کی بساط پوری طرح لپیٹنی ہوگی کیونکہ توانائی کے بحران کا بہانہ ہم ہاتھ سے دے ہی چکے ہوں گے۔ امیرِ تنظیم اسلامی نے سوال کیا کہ آخر اس میں کیا راز ہے کہ ساری بیرونی سرمایہ کاری صرف برقی توانائی کے شعبے میں آئی ہے جبکہ ہماری معیشت کا ہر شعبہ اس نظر کرم کا محتاج ہے۔ اس وضاحت کے ساتھ کہ سب یہودی صیہونی نہیں ہوتے ڈاکٹر اسرار احمد نے اسرائیل کے قیام کا پورا تاریخی پس منظر بیان کرتے ہوئے کہا کہ صیہونی تو اب عظیم تر اسرائیل کے قیام کا ارادہ بھی نہیں رکھتے اور اس سمت میں اگر کسی پیش قدمی پر مجبور ہو بھی گئے تو قدامت پسند اور مذہبی یہودیوں کے دباؤ کے تحت ہوں گے تاہم صیہونیت کا اصل منصوبہ پوری دنیا پر اپنی مالیاتی حکومت کا قیام ہے جس کے لئے امریکہ کے نیو ورلڈ آرڈر کو آلہ کار بنایا گیا ہے۔ انہوں نے انکشاف کیا کہ نہ صرف پروٹوکول آف دی ایلڈرز آف زائنیزم میں درج ہے بلکہ یہودیوں کی واحد اور اصل مذہبی کتاب "تالمود" میں بھی صاف بتایا گیا ہے کہ دنیا بھر کی آبادی انسانما حیوانوں یعنی گویم یا جنٹائل پر مشتمل ہے جن سے خدمت لینا اور صرف اس حد تک معاوضہ دینا کہ وہ خدمت جاری رکھنے کے لئے زندگی کا رشتہ استوار رکھ سکیں' یہودیوں کا حق ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ اس صیہونی منصوبے کی طرف عملی پیش رفت کا آغاز سابق امریکی صدر ریگن کے زمانے میں ہو گیا تھا جس کے بعد دنیا بھر میں نجکاری اور کھلی منڈی کی معیشت کا غلغلہ ہو گیا اور اب اپنی انتہا کو پہنچ رہا ہے جس کے نتیجے میں ہمارا معاشرہ جو پہلے ہی ابتری میں مبتلا ہے'

(باقی صفحہ ۳۵ پر)